ہفت روزہ

الفتح

کراچی

٢٦ر اکتوبر — ٢ر نومبر ١٩٧٢ء

حاکم کا سنا ہے جب سے فرماں
ہر خون کا خوں بہا ملے گا
مقتل میں چراغ جل اُٹھے ہیں
سب خوش ہیں کہ مدّعا ملے گا
جینے کا یہ — اجر کون کم ہے
مر کے تو کوئی صلا ملے گا
لاشوں کی قطار سج رہی ہے
. . . .
فرمائیے اور کیا ملے گا؟
محنت کا معاوضہ ہے گولی
محنت کا معاوضہ ملے گا
اے قومِ عظیم — اِنا للہ
لاحول ولا و — اِلّا باللہ

خالد علیگ







قیمت { ٥٠ پیسے
ہوائی ڈاک سے ٧٥ پیسے



معراج محمد خان عوام میں واپس آ گئے

(بیان صفحہ ۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

اداریہ

طبقاتی محاذ

آئین پر پاکستان پیپلز پارٹی اور حزبِ اختلاف کی تمام جماعتوں کے درمیان مشترکہ فارمولے پر سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ صدر بھٹو نے اپنی سیاسی زندگی میں انتخابات میں نمایاں کامیابی کے بعد یہ پہلی اہم کامیابی حاصل کی ہے جس کے بین الاقوامی سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ صدر بھٹو اور ان کی جماعت کی راہ میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں دائیں بازو کی جانب سے جس شدید ردِّعمل کا اندیشہ تھا وہ جماعتِ اسلامی کے مسٹر عبدالغفور، حزبِ اختلاف کے قائد مسٹر شوکت حیات، جمیعت العلمائے پاکستان کے شاہ احمد نورانی، آزاد ارکان کے قائد مسٹر شیرباز مزاری اور دوسرے لیڈروں کے، سمجھوتے پر دستخط کرنے کے بعد ٹل گیا ہے۔ دراصل جہاں آئین جیسی اہم دستاویز میں پاکستان پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان کو پاکستان میں شامل نہیں کیا وہاں حزبِ اختلاف نے بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی تحریری رضامندی دے دی ہے۔

حزبِ اختلاف نے بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے کے بارے میں آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا دائیں بازو کے اخبارات، ان کے نام نہاد رہنماؤں کے بیانات، پوسٹر اور پراپیگنڈے کا یہ عالم رہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیا تو اس دن پورا ملک احتجاج اور ہنگاموں کی لپیٹ میں آجائے گا۔ "الفتح" نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بارے دائیں بازو کے مؤقف کا ذکر کرتے ہوئے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ بنگلہ دیش کو فوری طور پر تسلیم نہ کیا جائے تو کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ تو دائیں بازو کی سیاست کے اثر میں ہیں۔ "الفتح" نے واضح کر دیا تھا کہ دراصل بنگلہ دیش کا قیام دائیں بازو کی سیاست کا نتیجہ ہے۔ وہ اس کی مخالفت محض اس لیے کر رہے ہیں کہ انہیں عوام کی حمایت حاصل ہو جائے اور وہ اس صورتِ حال سے وقتی طور پر فائدہ اٹھانے میں کامیاب ہو جائیں۔

آٹھ مہینے میں دائیں بازو پر مشتمل حزبِ اختلاف کو یہ یقین ہو گیا کہ اسے عوام کی حمایت بنگلہ دیش کے سوال پر بھی حاصل نہیں ہو گی لہٰذا انہوں نے اس مسئلے کو سمجھوتے کے دوران سودے بازی کے طور پر استعمال کیا اور بالآخر طبقاتی رشتوں نے سب کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کر دیا اور سبھی نے مسکراتے ہوئے دستخط ثبت کر دیئے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پارلیمانی سطح پر طبقاتی اتحاد میں تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں تو وہ کون سے عوامل ہیں جو مظلوم طبقات مزدوروں، کسانوں اور ان کے اتحادیوں کے مابین گزشتہ پچیس سال کی مدّت میں ایک مضبوط اور متحدہ محاذ کے قیام میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔ کیا وجوہ ہیں کہ مزدور کسان راج کے لیے انتہائی دیانتداری، بے غرضی اور خلوص سے کام کرنے والے آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں وہ آج سے پچیس سال پہلے کھڑے تھے۔ ان کے اتحاد کی راہ میں کون رکاوٹ بنا ہوا ہے

آج وقت کا سب سے اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ تمام دیانتدار بے لوث اور مخلص کارکن جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کے خلاف محاذ قائم کرلیں، ذاتی اور گروہی اختلافات ختم کر دیئے جائیں۔ تمام انقلابی قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔

خدائی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد نمبر ۳ —— شمارہ ۲۴

۲۶ اکتوبر - ۲ نومبر ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی

مدیر
ارشاد راؤ

نائب مدیر
وہاب صدیقی

بدلِ اشتراک:

	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
بدلِ اشتراک:	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:۔	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت:۔ ۶۰ فلس، دوبئی قطر: ۷۵ درم
سعودی عرب:۔ ۱۵ قرش، انگلستان۔ ۴ شلنگ ۶ پنس

سرورق: انور سمیع

مقامِ اشاعت
ہفت روزہ "الفتح" ۷۰۔ ڈی نرسری
کمرشل ایریا۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر:۔ ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

ٹیلیفون
۴۱۲۲۷۴

انسانی زندگی کی قیمت دس ہزار ـــ مقرر کر دی گئی

محنت کش نہیں'

امنِ عامہ کے اصل ذمہ دار'

نوکر شاہی اور سرمایہ دار



پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن مسٹر معراج محمد خاں نے کہا ہے کہ فیکٹریوں، ملوں اور صنعتی اداروں میں مزدوروں میں پائی جانیوالی بے چینی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اور اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ طبقہ اور پرولتاری طبقہ کے درمیان تضادات موجود ہیں۔ مسٹر معراج محمد خاں آج اپنے ایک اخباری بیان میں سندھ کی صوبائی حکومت کے کردار پر نکتہ چینی کرتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی کے کردار کو بھی زیرِ بحث لائے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیشہ ہی نوکر شاہی نے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کرکے مزدوروں کی بے چینی کو گولیوں لاٹھی چارج اور بڑے پیمانے پر گرفتاریوں سے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ پیدائشی اندھی رجعت پسند قوتیں یہ پیش بینی کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ محنت کش عوام کو کبھی بھی زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس قسم کے ہتھکنڈوں سے ان کی تحریک کو کچلا جا سکتا ہے۔ لیکن جس ستم ظریفی پر مجھے ذاتی طور پر دکھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی جو ایسے محنت کش عوام کی جدوجہد کی نمائندہ بن کر ابھری تھی جن کا استحصال کیا جا رہا ہے اب ایک ایسی سمت اسے موڑا جا رہا ہے جہاں وہ رجعت پسندوں سے پینگیں بڑھاتی ہوئی، سرمایہ داروں کی مدد کرتی ہوئی اور نوکر شاہی کی حوصلہ افزائی کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ جو لوگ واضح طور پر تاریخی حقیقتوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جس کسی نے بھی اس راستہ کو اپنایا اس کا کوئی مستقبل نہیں رہا۔ پائیدار زندگی صرف ان کے ہاتھوں میں ہے جو ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دیتے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ اگر محنت کش افراد اور عوام اور پیپلز پارٹی کے درمیان کوئی اختلاف رونما ہوا ہے تو یہ پیپلز پارٹی اور حکومت کا فرض ہے کہ اسے حل کرنے کی کوشش کرے۔ انھوں نے اس ضمن میں چند سوالات بھی اٹھائے۔ انھوں نے پوچھا ایسا کیوں ہے کہ محنت کش عوام جو ہماری کامیابی کا سبب بنے تھے آج مصائب میں مبتلا ہیں۔ جیلوں میں سڑ رہے ہیں، اور اپنی جانیں دے رہے ہیں اور یہ کیا بات ہے کہ کسی بھی سرمایہ دار کو کسی بھی عوام دشمن شخص کو یا نوکر شاہی سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو جیل میں بند نہیں کیا گیا۔ اور نہ ٹیکس کی چوری، رشوت بدعنوانی یا اسمگلنگ کے الزام میں ان پر کوئی مقدمہ ہی قائم کیا گیا۔ کیا ان میں سے کسی کو پھانسی دی گئی؟ "فکس اپ" کیا گیا یا ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت کوئی نوٹس دیا گیا؟ انھوں نے کہا ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ آج اگر پیپلز پارٹی ان خون چوسنے والے طفیلیوں اور پھپھوندیوں کی طرف داری کرتی ہے تو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ ہم اپنے دوستوں ساتھیوں اور محنت کش عوام کا اعتماد کھو بیٹھیں گے۔ انھوں نے کہا کہ قیامِ پاکستان سے ہی نوکر شاہی تمام خرابیوں کی جڑ رہی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آج بھی اس نوکر شاہی نے پیپلز پارٹی کو جو عوام کی دوست اور ان کی جدوجہد کی علمبردار تصور کی جاتی رہی ہے، تباہ کرنے کی سازش کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ڈپٹی کمشنرز، سکریٹریز انڈر سکریٹریز جو رجعت پسندوں کے حواری ہیں، ان وعدوں کو پورا نہیں کر سکتے جو پیپلز پارٹی نے عوام سے کئے تھے۔

نوآبادیاتی آقاؤں کے اس نظام کو جس قدر جلد ختم کیا جائے۔ اتنا ہی ہمارے ملک کے لئے بہتر ہوگا۔ کراچی میں مزدوروں پر فائرنگ کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ انتہائی بدنصیبی کی بات ہے کہ آج انسانی زندگی اس قدر ارزاں ہو چکی ہے کہ ہلاک کئے جانیوالے ہر شخص کا معاوضہ دس ہزار روپے مقرر کر دیا گیا ہے۔ یہ نجز اور امن و امان برقرار رکھنے والی مشنری کو مزدوروں اور محنت کش عوام کے اعتماد کو تباہ کرنے اور سرمایہ داروں کی مدد کرنے کی غرض سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے محنت کش عوام کو مشورہ دیا کہ وہ انقلاب کے ہراول دستہ کا کردار ادا کریں۔ پرولتاریہ کو ملکی سیاست کا ایک حصہ بنا دیں اور خود کو انقلاب کی بڑھتی ہوئی قوتوں میں شامل کر لیں۔ انہوں نے کہا ملک کے محنت کش عوام کے لئے یہ موزوں ترین وقت ہے کہ وہ ترقی پسند قوتوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرکے ان قوتوں کے عزائم کو ناکام بنا دیں جنھوں نے سامراجیوں اور سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ انھوں نے سیدو شریف سوات میں طالب علموں اور دوسرے مزدوروں پر حکومت سرحد کی جانب سے فائرنگ، مظالم اور بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کی بھی مذمت کی۔

احوالِ واقعی

سردار شوکت حیات،
پروفیسر غفور احمد،
اور شاہ احمد نورانی
پانچواں صوبہ بھول گئے

سیکرٹری
اور معاونِ خصوصی
نیویارک - لندن سے
درآمد کئے جا رہے
ہیں

امریکی امداد کا سیلاب بائیں بازو کو بہا لے جائے گا

واقفِ حال کے قلم سے

آئینی سمجھوتہ ہوگیا۔ فارمولا طے پاگیا۔

سفید پوش حلقوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس سے پہلے نیپ اور پیپلز پارٹی آپس میں اس طرح برسرِپیکار تھیں، جیسے ان کا آپس میں کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔ صدر بھٹو اب تک اپنے اس مؤقف پر عمل پیرا ہیں کہ بنیادی امور اسمبلی سے باہر طے کرلئے جائیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ حقیقت تسلیم نہیں کیا تھا اور اب بھی نہیں کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاست دانوں سے انھوں نے یہ موقف منوالیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان معاہدوں پر عمل درآمد کے عمل میں اختلافات ابھر آئے ہیں۔ نیپ اب تک ایسے دو معاہدے کرکے ان سے پھر چکی ہے۔ اب اس کے معاہدے میں نیپ کے علاوہ جمعیت علمائے پاکستان، کونسل مسلم لیگ، جماعت اسلامی، آزاد امیدوار، اور قبائلی ارکانِ اسمبلی کے نمائندے بھی شامل ہیں۔

آئینی کس مکش سے سفید پوش حلقوں میں ٹری کشیدگی تھی، غیر ملکی اخبار نویس بھی اسے سب سے بڑا مسئلہ قرار دے رہے تھے۔ کیونکہ اس پر بھی احتجاج کی لہر شروع ہو سکتی تھی۔ مرکز اور صوبوں کے اختیارات کا تمام پارلیمانی گروہوں میں طے ہو جانا بہرحال اطمینان بخش بات ہے۔ اس سے صدر بھٹو نے اصولی طور پر تمام جماعتوں سے بالواسطہ بنگلہ دیش بھی تسلیم کروالیا ہے۔ ایوانِ بالا، ایوانِ زیریں کے ارکان کی تعداد مقرر کرتے اور باقی تمام امور طے کرتے وقت صرف چار صوبوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچویں صوبے کا نام تک نہیں لیا۔ آئین ایک بنیادی دستاویز ہے۔ جو آنیوالے تمام دنوں کے لئے ہے۔ ہمارے وہ "عظیم رہنما" جو بنگلہ دیش کو اپنے ملک کا حصہ کہتے نہیں تھکتے اور اسے تسلیم کرنے کو نظریہ پاکستان کی بیخ کنی قرار دیتے ہیں جو قومی نظریے کا خاتمہ کہتے ہیں۔ انہیں آئین کی بنیاد طے کرتے وقت اس اکثریتی صوبے کا خیال تک نہیں آیا۔ اور جو کہتے تھے کہ مذاکرات شملہ میں مشرقی پاکستان کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ وہ بھی مشرقی پاکستان کو بھول گئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ذہنی طور پر یہ لوگ بھی بنگلہ دیش کی علیحدگی مان چکے ہیں۔ اب صرف سیاسی طور پر عوام کو مشتعل کرنے کے لئے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ اس پر جماعت اسلامی کے نمائندے پروفیسر غفور احمد جمعیت علمائے پاکستان کے شاہ احمد نورانی اور کونسل مسلم لیگ کے سردار شوکت حیات نے بھی دستخط کئے ہیں۔ انہیں بالکل خیال نہیں آیا کہ کوئی پانچواں صوبہ بھی ہے۔ جس کے نمائندوں کے لئے تاحال قومی اسمبلی کے ہال میں اور کچھ نہیں سیٹیں خالی تو رکھی گئی ہیں مگر، اس آئین میں تو ان نمائندوں کا برائے نام ذکر تک نہیں کیا گیا۔ یہ ان سیاسی رہنماؤں کی منافقت اور فریب دہی کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ ذہنی طور پر یہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرچکے ہیں۔ صرف عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لئے بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کرنے کے لئے شور مچاتے رہتے ہیں۔ اس سے ان کے سیاسی تدبر اور سیاسی خلوص کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہمارے یہ عظیم رہنما۔ صدر کے بے کراں اختیارات پر اعتراض کرتے تھے۔ اب انھوں نے وزیراعظم کو بھی یہ اختیار دے دیا ہے کہ عدم اعتماد کی قرارداد کے دوران اور بلکہ بعد میں بھی وہ پارلیمنٹ کو توڑنے کی سفارش کر سکتا ہے۔ وزیراعظم کو اختیارات صدر کی طرح ہی حاصل ہوگئے

امریکہ، روس کو ہمارے عزیز وطن اور عزیز صدر - دونوں سے دشمنی ہے

ہیں۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ قومی ترانہ صدر مملکت پر بجے گا۔ آئینی سربراہ صدر ہوگا۔ مگر انتظامی اختیارات بلکہ مطلق العنانی وزیر اعظم کو حاصل ہوگی۔ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ موجود ہے۔ اس لئے ماضی کی طرح پارٹیاں بدلنے کا سلسلہ بھی نہ ہوگا۔ ہم اسے اپنے حالات کے مطابق درست سمجھتے ہیں۔ مگر سوال یہی ہے کہ نیپ سمیت اپوزیشن باہر یہی مطالبہ کرتی رہی ہے کہ پارلیمانی نظام قائم کیا جائے جس میں وزیر اعظم کو وہی اختیارات ہوں جو برطانوی پارلیمانی نظام میں ہوتے ہیں۔ انتہائی مثالی پارلیمانی نظام کی بات کرتے تھے اگرچہ پاکستان میں ایسی مثالی جمہوریت کے لئے ابھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تمام جلسوں کی اور عوام کو بیوقوف بنانے کی بات تھی۔ مگر انہوں نے دستخط کرتے وقت وزیر اعظم کو لامحدود اختیارات دے دیئے ہیں۔ منافقت کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں وزیر اعظم کو یہ اختیار ماضی کے تجربات کی روشنی میں درست ہے کیونکہ ۱۹۵۸ء سے پہلے پانچ چھ برس مسلسل یہ روایت رہی کہ صرف چند ارکان اسمبلی اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیتے تو پارلیمانی بحران پیدا ہو جاتا۔ وزیر اعظم استعفیٰ دینے پر مجبور ہو جاتے، اقتدار چند بیوروکریٹس اور چند مفادی سیاستدانوں کے درمیان گھومتا رہا۔ عوام کو کبھی براہِ راست انتخاب کا موقع نہیں ملا، نہ اقتدار میں حصہ ملا۔ یہ لوگ جو اقتدار کی بندر بانٹ میں رہے۔ انھوں نے کبھی چاہا اور نہ کبھی انھیں فرصت ملی کہ وہ عوام کے مسائل کی طرف توجہ دے سکیں۔ کسی کابینہ کی عمر چھ ماہ کسی کی تین ماہ، کسی کی آٹھ ماہ، کسی کی ایک سال رہی۔ کوئی سیکرٹری خزانہ، وزیر خزانہ سے ہوتا ہوا وزیر اعظم بن گیا۔ کوئی سیکرٹری خزانہ، گورنر جنرل بن گیا۔ اور اس نے دستور ساز اسمبلی کو منسوخ کر ڈالا۔ ایک ڈپٹی کمشنر۔ سیکرٹری وزارتِ دفاع سے وزیر داخلہ پھر گورنر جنرل اور پھر پہلا صدر مملکت بن گیا۔ جس نے بے انتہا سیاسی جوڑ توڑ کیا۔ وزارتیں توڑیں، گورنر بدلے، اور بالآخر ۱۹۵۶ء کا دستور منسوخ کر ڈالا۔ اور مارشل لاء نافذ کر دیا۔ یہ صرف پارلیمانی نظام کی کمزوریوں سے ممکن ہوا۔ جس میں صرف چند مفاد پرست ارکان کے وفاداریاں بدل لینے سے وزارت خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ پہلے آئینی ردوبدل سے صرف وزارتیں ٹوٹتی تھیں اب اس آئینی بحران سے ملک بھی ٹوٹ گیا۔ اتنے بڑے خوفناک تجربے کے بعد ہم اور آئینی عیاشیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

اس ملک پر اب تک برسر اقتدار رہنے والا ٹولہ دراصل اب بھی وہی جوڑ توڑ چاہتا ہے۔ وہ اب بھی اس ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔ تاکہ عوام میں جو سیاسی شعور اور اپنے حقوق کے حصول کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اس سے خائف ہو کر یہ مفاد پرست چاہتے ہیں کہ عوام کو پھر صوبائی کشمکش میں الجھا دیا جائے۔ اور انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کا موقع نہ دیا جائے۔ آئین۔ کھانے پینے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے کسی کا پیٹ نہیں بھرے گا۔ یہ تو محض ایک خاکہ ہے ایک ڈھانچہ ہے، جس پر ملک کی عمارت کھڑی ہوتی ہے لیکن یہ تو محض کاغذی ڈھانچہ ہے۔ حقیقی ڈھانچہ تو عوام ہیں، اگر وہ خوشحال ہوں گے اور ذہنی طور پر مطمئن ہوں گے، تو ملک کی عمارت یقیناً کھڑی رہے گی۔ منافقتوں اور جذبات کے سہارے یہ عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔

صدر بھٹو اپنی تمام تر صلاحیتوں اور تدبر کے باوجود اس ٹولے کے جوڑ توڑ کا شکار ہو رہے ہیں۔ یہ ٹولہ صرف اندرونِ ملک ہی جوڑ توڑ نہیں کرتا بلکہ بیرونِ ملک طاقتوں سے بھی اس کے روابط ہیں۔ وہ عوام جنہوں نے مسٹر بھٹو کو ایوانِ صدر تک پہنچایا ہے، انہیں صدر بھٹو بھول گئے ہیں۔ اس طرح پیپلز پارٹی کے کارکن، دانشور اور مزدور رہنما، جن کے دم سے پیپلز پارٹی کا انتخاب جیتنا اور عوام میں مقبول ہونا ممکن ہوا، ان سے بالکل رابطہ توڑ کر بھٹو صاحب اسی اوپر والے دائرے پر اپنی حکومت کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ وہ لوگ جو ساری عوامی جدوجہد کے دوران پاکستان سے اور عوام سے دور رہے، یورپ اور امریکہ کے پُرآسائش ماحول میں زندگی گزارتے رہے جنہیں پاکستانی عوام کے مسائل کا کوئی علم نہیں ہے۔ ان کی براہِ راست تقرریاں کی جا رہی ہیں —— صدر بھٹو اس خیالِ باطل کا شکار ہیں کہ ملک کو صرف آکسفورڈ، ہاورڈ کے فارغ التحصیل اور انگریزی بولنے والے ہی چلا سکتے ہیں۔ اس لیے وہ سیکرٹری اور معاونین خصوصی باہر

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



شہید سبز علی



زخمی فاروق



زخمی دلاور



زخمی گل محمد (آدم جی ملز)



زخمی محمد صابر (حسینی ملز)



ایک زخمی۔ نام معلوم نہیں ہو سکا۔

پولیس نے لانڈھی کورنگی کو محاذِ جنگ میں تبدیل کر دیا

وہاب صدیقی

۱۷ اور ۱۸ اکتوبر کی درمیانی شب تھی۔ رات کا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ ایئر پورٹ تھانے میں خلافِ معمول دن کا سماں تھا۔ سپاہیوں میں ہلچل تھی۔ سپاہی آ رہے تھے، جا رہے تھے، کچھ کے کندھوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں، بعض نے بندوقیں اس انداز میں تھام رکھی تھیں جیسے ان کی انگلیاں ٹریگر دبانے کے لیے بے قرار ہوں۔ بعض کے پاس لاٹھیاں تھیں، کچھ ٹرکوں میں بیٹھے ہوئے گپ شپ لڑا رہے تھے۔ بعض سگریٹوں سے اپنا غم غلط کر رہے تھے۔ تھانہ بھاری بوٹوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی مسلسل بج رہی ہے۔ وائرلیس پر ہدایات وصول ہو رہی تھیں ـــــ غرضیکہ ایک ہنگامہ تھا۔ جوں جوں گھڑی کی سوئی پانچ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھی ہنگامہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ گھڑی نے پانچ بجنے کا اعلان کیا تو ٹیلیفون پر ایک پیغام موصول ہوا۔ یہ پیغام موصول ہوتے ہی سپاہی ٹرکوں میں بیٹھنے لگے۔ پولیس افسر جیپوں میں براجمان ہو گئے۔

تقریباً ۵ بجکر پندرہ منٹ پر پولیس کا یہ کارواں اس شان سے روانہ ہوا کہ اس قافلہ میں ڈپٹی کمشنر کی کار کے علاوہ پولیس کی پانچ جیپیں سات ٹرک اور ایک پانی پھینکنے والی گاڑی تھی۔ اس کا رُخ لانڈھی کی طرف تھا۔

دوسری جانب داؤد اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے شب بیدار مزدوروں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ پورے علاقے میں ہولناک خاموشی اور سکوت طاری تھا، ایسا سکوت جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کی عقابی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔ پوری رات اسی عالم میں گزری۔ سحری کا وقت ہوا تو روکھی سوکھی کھا کر روزہ رکھ لیا، بعض نے صرف پانی پی کر روزے کی نیت کر لی۔ روزہ رکھ کر وہ معمول کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔



رینجرز پولیس گل احمد ٹیکسٹائل ملز میں پہرہ دے رہی ہے۔

تاریکی سے فائدہ اٹھا کر شیلنگ اور فائرنگ شروع کر دی گئی

تقریباً پونے چھ بجے تک پولیس پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے چکی تھی۔ پولیس کی قیادت ڈپٹی کمشنر کراچی کنور ادریس کر رہے تھے۔ پولیس کا پہلا نشانہ داؤد کاٹن ملز تھا۔ تقریباً صبح چھ بجے پولیس نے آنسو گیس کے شیل پھینکنے شروع کیے۔ اس شیلنگ کی آڑ میں پولیس داؤد کاٹن ملز کی طرف بڑھی۔ سب سے آگے بلڈوزر تھا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق شیلنگ اتنی زبردست تھی کہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی محاذ پر شدید جنگ ہو رہی ہے، دشمن برسرپیکار ہے۔ اس نے بتایا کہ اتنی زبردست شیلنگ جنگ کے دوران اگر بھارتی فوج پر کی جاتی تو وہ پاکستانی علاقہ میں گھس نہیں سکتی تھی۔ گیٹ کے نزدیک پہنچ کر پولیس نے فائرنگ بھی کی۔ بلڈوزر سے گیٹ توڑ کر پولیس داؤد کاٹن ملز میں داخل ہوئی اور پی پی آئی کی رپورٹ کے مطابق پولیس نے ملز میں داخل ہوتے ہی بجلی فیل کر دی۔ اور اندھیرے میں مزدوروں پر آنسو گیس کے شیل پھینکنے اور لاٹھی چارج کیا۔ اس طرح تھوڑی دیر میں پولیس نے ملز پر قبضہ کر لیا۔ داؤد کاٹن ملز میں کارروائی مکمل کرنے کے بعد پولیس نے گل احمد ٹیکسٹائل ملز پر دھاوا بول دیا۔ یہاں بھی گیٹ بلڈوزر سے توڑا گیا اور ایک دیوار کو بھی ٹریکٹر سے گرایا گیا۔ گل احمد ملز کے محنت کشوں نے نہتے ہونے کے باوجود پامردی سے پولیس کا مقابلہ کیا جس کے جواب میں ان نہتے مزدوروں پر پولیس نے بندوقوں کے دہانے کھول دیئے۔ پاکستان پریس انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق پولیس نے بائیس راؤنڈ چلائے۔ یہ راؤنڈ اندھا دھند چلائے گئے۔ پی پی آئی کی خبر کے مطابق اس فائرنگ سے دو افراد موقع پر ہی شہید ہو گئے جب کہ ایک مزدور نے سول ہسپتال میں دم توڑ دیا اور ایک مزدور جناح ہسپتال میں چل بسا۔ متعدد مزدور زخمی ہوئے۔ پولیس نے داؤد کاٹن ملز اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز سے تقریباً سو مزدوروں کو گرفتار کر لیا جن میں گل احمد ٹیکسٹائل ملز مزدور یونین کے صدر ٹکا خان بھی شامل ہیں ——!

داؤد اور گل احمد ملز کے محنت کشوں نے بتایا ہے کہ پولیس نے صبح سحری کے وقت سے داؤد اور گل احمد ملز کو گھیرے میں لینا شروع کر دیا تھا۔ تقریباً چھ بجے پولیس نے بغیر کسی وارننگ کے اچانک داؤد کاٹن ملز پر آنسو گیس کے شیل پھینکنا شروع کر دیئے۔ بلڈوزر سے گیٹ توڑ کر پولیس ملز میں داخل ہوئی اور نہایت بے رحمی سے لاٹھی چارج کیا۔ جس سے متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔

اس کے بعد پولیس نے گل احمد ٹیکسٹائل ملز کا رخ کیا۔ گیٹ اور ایک دیوار کو بلڈوزر سے توڑ کر اندر داخل ہوئی اس ملز میں معمول کے مطابق کام ہو رہا تھا۔ جیالے محنت کشوں نے سرمایہ داروں کی محافظ پولیس کا پامردی اور جرأت سے مقابلہ کیا۔ نہتے مزدوروں نے مسلح پولیس سے ٹکر لی۔ برطانوی نوآبادکاروں کی تربیت یافتہ پولیس ذہنیت نے رنگ دکھایا۔ نہتے محنت کشوں کا سینہ چھلنی کر دیا گیا۔ دو افراد موقع پر ہلاک ہو گئے۔ ایک بیس سالہ مزدور محمد صابر اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے بعد گھر واپس جا رہا تھا کہ پولیس کی گولی لگنے سے گل احمد ملز کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر ہلاک ہو گیا۔ گولی اس کی پیشانی پر لگی تھی۔ پیشانی پر گولی لگنے سے ثابت ہوتا ہے کہ پولیس کا مقصد مزدوروں کو منتشر کرنا نہیں تھا۔ کیونکہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی جاتی ہے۔

ہوائی فائرنگ سے ہجوم منتشر نہ ہو تو پاؤں اور ٹانگوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مگر پولیس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مزدوروں کا شکار کرنا چاہتی تھی۔ لانڈھی کے ایک باشندے کا کہنا ہے کہ فائرنگ کی آواز سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی وڈیرہ اپنی شکارگاہ میں بٹیروں اور تیتروں کا شکار کھیل رہا ہو۔

محمد صابر گجرات کا رہنے والا تھا۔ روزگار کی تلاش میں کراچی آیا۔ دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ملازمت ملی۔ والدین خوش تھے کہ ان کا بیٹا "کماؤ پوت" ہو گیا ہے انہوں نے اس کی منگنی کر دی۔ عیدالفطر کے بعد شادی ہونے والی تھی۔ صابر چھٹی لے کر اپنے گھر گجرات جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ والدین کے دلوں میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ گھر میں شادیانے بج رہے تھے لیکن سرمایہ داروں کو یہ خوشی ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے اس کے گھر کو ماتم کدہ میں تبدیل کر دیا۔ اس کی ہونے والی بیوی اب بھی اس کی منتظر ہے لیکن صابر ایسے سفر پر



زخمی ولایت



زخمی غریب شاہ

روانہ ہوگیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

دوسرا شہید ایک بارہ سالہ لڑکا عمر محمد ہے۔ وہ نیو مظفر آباد کالونی میں ایک سائیکل کی دکان پر کام کرتا تھا۔ عمر محمد اپنے خاندان کا واحد کفیل تھا۔ ۱۸ اکتوبر کو سحری کھانے کے بعد دکان پر جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ موت کا فرشتہ اس کی تاک میں تھا۔ گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے قریب پہنچا تو پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

کراچی انتظامیہ کے پریس نوٹ کے مطابق تین مزدور ہلاک اور پندرہ سے بیس مزدور زخمی ہوئے۔ پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ داؤد کاٹن ملز اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز پر مزدور گزشتہ دس دن سے قبضہ کیے ہوئے تھے۔ جس کو ۱۸ اکتوبر کو پولیس نے ختم کردیا۔ پریس نوٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ڈپٹی کمشنر، ایس ایس پی اور ایس ڈی ایم نے میگافون کے ذریعے مزدوروں کو وارننگ دی جسے مزدوروں نے قطعی طور پر نظر انداز کردیا جس کے بعد پولیس کے لیے یہ کارروائی ناگزیر ہوگئی۔ پریس نوٹ میں تین مزدوروں کی ہلاکت کو مسلح تصادم کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔

داؤد کاٹن ملز اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ مشین ٹول فیکٹری کی انتظامیہ نے مزدوروں کی یونین سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ مزدوروں نے مطالبہ کیا کہ معاہدے پر عمل درآمد کیا جائے لیکن انتظامیہ نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ انتظامیہ کی اس ہٹ دھرمی نے محنت کشوں کو ہڑتال کرنے پر مجبور کردیا۔ بجائے اس کے کہ انتظامیہ اپنے رویے پر نظر ثانی کرتی اور معاہدے پر عمل درآمد کرتی، اس نے نوکر شاہی سے گٹھ جوڑ کر کے بہت سے مزدور رہنماؤں اور یونین کے سرگرم کارکنوں کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کروادیا اور تقریباً ۸۰ مزدوروں کو غیر قانونی طور پر برطرف کردیا۔

لانڈھی اور کورنگی کے صنعتی مزدوروں نے مشین ٹول فیکٹری کے محنت کشوں کی حمایت میں دو دن کی ہڑتال کی ملز مالکان نے اس مدت کی تنخواہ کاٹ لی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کو مشین ٹول فیکٹری کے محنت کشوں کی حمایت کرنے کی سزا دی جائے اور محنت کشوں کے بڑھتے ہوئے اتحاد کو روکا جائے، لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کے رہنماؤں نے ملز مالکان سے ملاقاتیں کیں، گفت وشنید کی تاکہ ملز مالکان دو دن کی تنخواہ ادا کردیں لیکن ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ جب مفاہمت کے سب دروازے بند ہوگئے تو لیبر آرگنائزنگ کمیٹی نے ہڑتال کی تنخواہ کی ادائیگی، گرفتار شدہ مزدوروں کی رہائی اور وارنٹ گرفتاری کی واپسی کے لیے ہر شفٹ میں دو گھنٹے کی علامتی ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ روزانہ کی علامتی ہڑتال کے باوجود محکمۂ محنت اور صوبائی وزارتِ محنت کے کان پر جوں تک نہیں رینگی!" صوبائی وزیرِ محنت ستار گبول نے لانڈھی، کورنگی کے صنعتی علاقے میں جانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی، حالانکہ موصوف عوامی نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرتے

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں

یہ انتہا پسندی نہیں مزدور اتحاد کا عملی مظاہرہ تھا


عزیزالحسن


ریاض حسین

ریاض حسین اور عزیزالحسن کراچی میں مزدوروں کے ہراول دستے کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ اقبال نیازی خضر اور اکرم ان کے دستِ راست ہیں۔ ریاض حسین داؤد کاٹن ورکرز یونین کے صدر اور عزیزالحسن جنرل سیکرٹری ہیں۔ یحییٰ کے دورِ حکومت میں بھی ریاض اور عزیز کو مارچ ۱۹۷۰ء میں گرفتار کیا گیا۔ جب بھی ان پر تخریب کاری اور ملک دشمنی کا الزام لگایا گیا تھا۔ ریاض کو مارشل لاء کے تحت ۵ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ جو مغربی پاکستان میں آج تک کسی مزدور رہنما کو نہیں دی گئی۔ داؤد نے سرمایہ دارانہ ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہوئے عزیز کو جرمنی اور برطانیہ بھیجنے کی پیش کش کی تھی جسے عزیز نے پائے حقارت سے مسترد کردیا۔ لانڈھی کے صنعتی علاقے میں ان کی جدوجہد قربانیوں اور ان مزدوروں پر کئے جانیوالے ظلم وتشدد کے المناک واقعات کی عکاسی کرتی ہے۔

اس جدوجہد کے نقوش اتنے گہرے ہیں کہ مزدور تحریک انھیں فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کے عزائم میں پختگی، عمل میں انقلابی تڑپ اور مزدور دوستی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

لانڈھی میں مزدوروں کی حالیہ جدوجہد کے بارے میں حکومتی ادارے، مقبوضہ اخبارات، اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ عوام میں یہ تاثر پھیلانے میں سرگرم عمل ہیں کہ انتہا پسند عناصر صنعتی امن درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ حکومت نے مزدوروں کو اتنی مراعات دیدی ہیں کہ اب یہ ہنگامہ آرائی محض تخریب کاری کے لئے ہو رہی ہے۔ اور حکومت کو اسے کچل دینا چاہیئے۔ یہ پروپیگنڈہ غلط، لغو اور بے بنیاد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لانڈھی کے صنعتی علاقے میں کام کرنیوالے مزدوروں نے مشین ٹول فیکٹری کے مزدوروں کی حمایت میں دو روز کی ہڑتال کرکے مزدور اتحاد کا مثالی مظاہرہ کیا تھا۔ یہ اتحاد سرمایہ داروں، نوکر شاہی اور حکومت میں ان کے ایجنٹوں پر ناگوار گزرا۔ چنانچہ انھوں نے مزدوروں کے سیاسی شعور اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ دینے سے انکار کردیا، تاکہ آئندہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی ہمدردی کے اظہار سے گریز کریں۔

لانڈھی کے صنعتی علاقے میں دو، دو گھنٹے کی علامتی ہڑتال مزدور اتحاد کو برقرار رکھنے اور سرمایہ داروں کو اُن کے ناپاک عزائم سے باز رہنے کے لئے کی گئی۔ یہ انتہا پسندی نہیں بلکہ اپنے حقوق کے حصول اور مزدور اتحاد کا عملی مظاہرہ تھا۔

مزدوروں کی اس تحریک کو سبوتاژ کرنیکے لئے نوکر شاہی نے وسیع پیمانے پر انتظامات کر رکھے تھے۔ ان کی اپنی صفوں میں سے بعض نے حکومت کی پالیسیوں کی بلا سوچے سمجھے اور اندھی حمایت کی۔ یہ لوگ جن کا تعلق لانڈھی سے ہی ہے، بعد میں مرکزی وزیرِ محنت اور صوبائی وزیرِ محنت سے قصرِ ناز میں ملے۔

مزدوروں کو کچل دو — قرضے ملیں گے

عالمی بنک اور کنسورشیم کی شرط



عثمان بلوچ پولیس کی حراست میں

متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر عثمان بلوچ کی پریس کانفرنس

کراچی میں ۸۰ ملیں بند - ۲۵ ہزار مزدور فاقہ کشی کا شکار ہیں

الفتح رپورٹ

۷ اور ۸ جون ۱۹۷۲ء کا خون ابھی خشک بھی نہیں ہوا تھا، مزدوروں کے دِلوں میں گھاؤ ابھی بھرنے بھی نہ پائے تھے کہ ۱۸ اکتوبر کو لانڈھی کے محنت کشوں کو خون میں نہلا دیا گیا۔ گولی لانڈھی میں چلی منگھوپیر کے مزدور تڑپ اٹھے کیونکہ یہ سب محنت کش ہیں ایک ہی طبقہ سے متعلق ہیں اور ان کے دِل اس بین الاقوامی پرولتاری جذبے سے معمور ہیں جو آج کی دنیا کی خصوصیّت ہے اور کل کی اُمید!

اسی سلسلے میں ۱۸ اکتوبر کی سہ پہر کو متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر جناب عثمان بلوچ نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ داؤد اور گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں پر پولیس کی وحشیانہ فائرنگ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ —— "جون کی فائرنگ کے بعد ہمیں اندیشہ تھا کہ مزدور دشمن طاقتیں عنقریب دوسرا حملہ کریں گی۔ ۷ جون کو نوکر شاہی اور سرمایہ داروں کا گٹھ جوڑ سب پر واضح ہو گیا تھا۔ ہم نے اس خدشہ کا اظہار ۲۴ جون کو صدر بھٹو سے بھی کر دیا تھا۔ اور صدر بھٹو نے وعدہ کیا تھا کہ تمام گرفتار شدہ مزدوروں اور رہنماؤں کو رہا کر دیا جائے گا۔

جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ —— "سرمایہ دار اور حکومتی ذرائع ابلاغِ عامہ یہ پراپیگنڈہ کر رہے ہیں کہ مزدور پوری پیداوار نہیں دیتے، کام نہیں کرتے، مفت کی تنخواہ لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے حکومت کو تجویز پیش کی تھی کہ ہر ملز کے لیے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائے جس میں حکومت کے نمائندے، مزدوروں کے نمائندے اور سرمایہ داروں کے نمائندے شامل ہوں، اور یہ کمیٹی اس بات کا جائزہ لے کہ پیداوار کی کمی کے کون ذمہ دار ہیں حکومت نے یہ تجویز مان لی تھی۔ اسی سلسلے میں متحدہ مزدور فیڈریشن کے چند رہنما صوبائی وزیرِ محنت جناب ستار گبول سے ملنے کے لیے گئے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے صدر بادر خان جنرل سیکرٹری بجنت رواں، متحدہ مزدور فیڈریشن کراچی کے آرگنائزنگ سیکرٹری کرامت علی، صاحب انور اور حبیب الرحمٰن ہزاروی شامل ہیں۔

ان کی گرفتاری اس بات کی علامت ہے کہ حکومت تحقیقاتی کمیٹیاں قائم کرنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ اس سے پیداوار کی کمی کے ذمہ دار سرمایہ داروں کا راز فاش ہو جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ مزدوروں نے جناب نبی احمد اور ظہیر اختر بیدردی کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی کے سروے کے مطابق کراچی میں اس وقت ۸۰ ملز بند ہیں جس کی وجہ سے ۲۵ ہزار محنت کش فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

مسٹر عثمان بلوچ نے کہا کہ یہ طرفہ تماشہ ہے کہ ایک جانب حکومت لیبر قوانین دیتی ہے، بے روزگاری کو ختم کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری جانب سرمایہ دار ملوں میں تالہ بندی کر رہے ہیں، مزدوروں کی چھانٹی کر رہے ہیں لیکن حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔"

جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ "جن مزدوروں کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کیا گیا ان کے بارے میں حکومت کہتی ہے کہ انھوں نے صدر بھٹو کو گالیاں دی تھیں: یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے۔ ہماری کسی سے ذاتی لڑائی نہیں بلکہ ہماری جدوجہد طبقاتی جدوجہد ہے۔" جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ "مزدوروں کو گالیاں دینے کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے، لیکن سہگل کو گالیاں دینے کے صلے میں پی آئی اے کا سربراہ بنا دیا جاتا ہے۔"

انھوں نے کہا کہ "سرمایہ دار اور نوکر شاہی تین اسباب کی بنا پر مزدور تحریک کو کچلنا چاہتی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہ دونوں طاقتیں ۱۹۶۳ء کے دورِ بربریت کو واپس لانا چاہتی ہیں تاکہ لوٹ کھسوٹ اپنی برہنہ شکل میں جاری رہے۔ دوسری وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ قرضہ دینے والے بین الاقوامی اداروں مثلاً عالمی بنک اور کنسورشیم نے شرط لگائی ہے کہ وطن عزیز میں مزدوروں اور کسانوں کی اُبھرتی ہوئی تحریک کو کچل دیا جائے، تو قرضے ملیں گے۔ چنانچہ نوکر شاہی اور حکومت ان کی ہدایات پر عمل کر رہی ہے۔ سوئم یہ کہ حکومت عوامی مسائل، مہنگائی بیروزگاری، تالہ بندی، چھانٹی، آئین سازی سے عوام کی توجہ ہٹانا چاہتی ہے۔"

جناب عثمان بلوچ نے کہا کہ "صدر بھٹو نے کہا تھا کہ میں عوام سے سمجھوتہ کروں گا۔ لیکن ان کی حکومت سیاسی جماعتوں سے سمجھوتے کر رہی ہے۔ عوام کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان سمجھوتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ سرحد اور بلوچستان میں محنت کشوں اور کسانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا ہے۔ جھل جاؤ اور تخت بھائی میں کسانوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ سندھ اور پنجاب میں محنت کشوں کے لہو سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اب رجعت پسند عناصر صدر بھٹو کو اپنے گھیرے میں لے رہے ہیں، اور ان محنت کشوں کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ جنھوں نے صدر بھٹو کو "صدر بھٹو" بنایا۔

مسٹر عثمان بلوچ نے کہا کہ نوکر شاہی نے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر کے مزدوروں کے خلاف مکروہ منصوبے بنائے۔ کراچی میں دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ دیواروں پر مطالبات اور نعرے لکھنے پر پابندی لگا دی گئی حالانکہ مزدوروں کے لئے سستے پروپیگنڈے کا یہ واحد ذریعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ گدو تھرمل، کھاد فیکٹری ملتان، مشین ٹول فیکٹری لانڈھی کے واقعات کے پس منظر کو دیکھتے ہوتے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رجعت پسند اور مزدور دشمن طاقتوں نے مزدوروں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی۔

لانڈھی، کورنگی کے حالیہ المیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس تحریک کی ابتداء مشین ٹول فیکٹری سے ہوئی۔ طے شدہ معاہدے کے تحت مزدوروں نے مراعات کا مطالبہ کیا۔ جب انتظامیہ نے اس معاہدے پر عملدرآمد کرنے سے انکار کر دیا۔ تو مشین ٹول فیکٹری کے مزدوروں نے جزوی ہڑتال کی۔ اس پر انتظامیہ نے تقریباً ۸۰ مزدوروں کو برطرف کر دیا اور بہت سے مزدور رہنماؤں کو ڈی پی آر کے تحت گرفتار کروا دیا۔ ان کی حمایت میں لانڈھی کورنگی

کے صنعتی علاقوں نے دو دن کی مکمل ہڑتال کی۔ اور بعد میں ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ کے لیے دو گھنٹے کی روزانہ جزوی ہڑتال کرنی شروع کی، مزدوروں کا مطالبہ جائز تھا۔ لیکن نوکر شاہی اور حکومت نے حالات سدھارنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ صوبائی وزارتِ محنت نے بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ صوبائی وزیر محنت ستار گبول نے مزدوروں سے ملاقات نہیں کی۔ دراصل حکومت اور نوکر شاہی معاملہ کو طول دے کر مزدوروں کو کچلنا چاہتی تھی۔ لانڈھی کو پولیس اسٹیٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ۱۸ر اکتوبر کو پولیس ایکشن کیا گیا۔

انھوں نے کہا کہ منگھوپیر کے مزدور لانڈھی کورنگی کے اپنے بھائیوں کے ساتھ ہیں اور کسی بھی حالت میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

عثمان بلوچ نے ۱۹ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو یہ بیان جاری کیا

استحصال ختم کرنے کا وعدہ کہاں گیا؟

متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر جناب عثمان بلوچ نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ لانڈھی کے مزدوروں پر باقاعدہ مورچہ بندی کے بعد پولیس اور نیم فوجی تنظیم کی طرف سے باقاعدہ حملہ کے سلسلے میں فیڈریشن کی جانب سے کل ہی ہم نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن آج پھر اس لیے بیان جاری کرنا پڑ رہا ہے کہ سندھ کی حکومت کے سربراہ وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو صاحب نے مزدوروں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے ایسا بیان جاری کیا ہے جس کا مقصد رائے عامہ کو گمراہ کرنا ہے۔ وزیر اعلیٰ ممتاز بھٹو صاحب کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس وقت مسلح حملہ اور طاقت کے استعمال کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ صحیح صورتِ حال کی وضاحت لانڈھی کورنگی لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کے ساتھیوں نے کر دی ہے کہ مذاکرات جاری تھے اور وزیر محنت ستار گبول نے دوپہر میں میٹنگ مقرر کی تھی جس میں اس صورتِ حال کا بہتر حل تلاش کرنے کی کوشش کی جانی تھی۔ اس کے علاوہ جن لوگوں کی گرفتاری مطلوب تھی، ان کی طرف سے پرسوں ہی اس بات کا اعلان کر دیا گیا تھا کہ وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کو تیار ہیں۔ ان حالات میں مزدور کُش اقدام کو حکومت کی طاقت پر انحصار کرنے اور طاقت کے زور پر حکومت کرنے کی پالیسی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

وزیرِ اعلیٰ نے اپنے بیان میں یہ کہہ کر سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے کہ لانڈھی اور سائٹ کے مزدور کارکنوں سے رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ موجودہ حکومت کی تاریخ پیدائش سے آج تک حکومت نے کبھی بھی مزدوروں کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کا طریقہ دریافت کرنے کے لیے مزدور رہنماؤں کی کوئی میٹنگ نہیں بلائی گئی۔ اس سلسلے میں صدر بھٹو کی اس ہدایت کو بھی وزیر اعلیٰ اور ان کی کابینہ نے نظر انداز کر دیا ہے کہ ہر تیسرے مہینے صوبائی سطح پر سہ فریقی کانفرنس منعقد کی جائے۔ بار بار نشاندہی کے باوجود حکومت نے وقتی طور پر پیدا ہونے والے مسائل سے آگے بڑھ کر صنعتی بے چینی کے بنیادی اسباب کو دور کرنے کی کوئی مخلصانہ کوشش نہیں کی ہے۔ وقتی مسائل کو حل کرنے کے لیے بھی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کی مثالیں ملتان گڈو، کھوسکی، کوٹری اور کراچی کے واقعات ہیں۔ جہاں طاقت کے استعمال کو ہی مسائل کے حل کے طریقے کے طور پر اختیار کیا گیا۔

وزیر اعلیٰ صاحب نے کہا ہے کہ نئی لیبر پالیسی اور بعد میں مزدوروں کی خواہشات کے مطابق اس میں ترمیم کے بعد ایسے واقعات کا ہونا اور زیادہ المناک ہے اور یہ کہ موجودہ حکومت نے مزدوروں کو وہ کچھ دیا ہے جو اس سے پہلے انہیں حاصل نہیں تھا۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ مزدوروں کو ملنے والی سہولتوں میں اضافہ کیا گیا ہے اور یہ اضافہ پہلی مرتبہ ہوا ہے لیکن ہم وزیر اعلیٰ کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ عوام نے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو پہلی مرتبہ اس لیے اقتدار کی کرسیوں تک پہنچایا تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق استحصال کی ہر شکل کا خاتمہ کریں۔ وزیر اعلیٰ صاحب بتائیں کہ اس وعدے کے مقابلہ میں ان کی سہولتوں کی کیا حقیقت ہے جو مزدوروں کو مہیا کی گئی ہیں یا کی جانے والی ہیں۔

یہ بات بھی سراسر غلط ہے کہ مزدور قوانین میں مزدوروں کی خواہشات کے مطابق تبدیلی کی گئی ہے۔ سہ فریقی لیبر کانفرنس میں مزدوروں کے نمائندوں نے قوانین میں ترمیم کے متعلق اپنی متفقہ رائے کا اظہار تحریر میں کر دیا تھا۔ اور صدر بھٹو کی اس یقین دہانی کی بنیاد پر کیا تھا کہ قوانین میں ترمیم مزدوروں کی خواہشات کے مطابق کی جائیں گی لیکن مرکزی وزیر محنت نے جن تجاویز کا اعلان کیا۔ وہ مزدوروں کی تجویز کردہ ترمیم سے بہت ہی کم ہے۔ اس کے علاوہ مجوزہ ترامیم میں سے اب تک صرف دو ایسے قوانین میں ترمیم کی گئی ہے جن سے مزدوروں کے عام حالاتِ کار میں کوئی بہتری پیدا نہیں ہوتی۔ روزمرّہ کے حالات اور تعلقات سے متعلق ترامیم ابھی سرد خانے میں پڑی ہیں اور اس وقفے سے فائدہ اٹھا کر سرمایہ دار طبقہ وہ تمام ہتھکنڈے اختیار کر رہا ہے کہ جس وقت یہ ترامیم قانون کی شکل میں نافذ ہوں تو اس سے بھی مزدوروں کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکے۔

وزیر اعلیٰ نے پیداوار کا مسئلہ اٹھا کر ایک بار پھر لوگوں کو گمراہ کرنے اور مزدوروں سے عوام کی ہمدردی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں پہلے ہی سے تمام سرمایہ دار اخبارات اور حکومت کے ذرائع تشہیر میں لگے ہوئے ہیں۔

ہم پہلے بھی وزیرِ اعلیٰ صاحب کے علم میں لا چکے ہیں اور آج پھر ان سے سوال کرتے ہیں کہ اگر مزدوروں کو خام مال مہیا نہ کیا جائے یا خام مال کی کوالٹی خراب ہو، مشینیں بند پڑی ہوں، اسپیئر پارٹس مہیا نہ کیے جائیں تو پیداوار کا معیار اور مقدار معمول کے مطابق کس طرح رہ سکتا ہے، کارخانوں میں تالہ بندیاں اور چھانٹیاں جاری ہوں، ملیں دھڑا دھڑ بند ہوتی رہیں اور حکومت یہ ساری کارروائیاں خاموشی سے دیکھتی رہے تو پیداوار میں کمی کی ذمہ داری کس پر ہو گی۔

اس ملک اور اس کی خوشحالی سے مزدوروں اور محنت کشوں سے زیادہ کسی کو دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ قیمتوں میں اضافے سے وڈیروں، سرمایہ داروں اور رشوت خور نوکر شاہی پر کوئی اثر نہیں پڑتا تاہم محنت کشوں اور متعین آمدنی والے نچلے درمیانہ اور درمیانے طبقے کو دو وقت کی روٹی مہیا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بارہا تجویزیں پیش کی ہیں اور زور دیا ہے کہ فنی ماہرین حکومت اور مزدوروں پر مشتمل

باقی صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں



امریکی ماہرین کے خفیہ اجلاس میں سرمایہ دار بھی شریک ہوئے

ہوٹل انٹر کانٹیننٹل میں سنٹو کے ماہرین کا خفیہ اجلاس

الفتح رپورٹ

ستمبر کے آخری ہفتے میں کراچی کے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں سینٹو کے ماہرین کا ایک خفیہ اجلاس ہوا جس میں ایران اور ترکی کے علاوہ پاکستان کی صورتِ حالات کا خصوصی جائزہ لیا گیا اور ملک میں اُبھرتی ہوئی مزدور اور کسان تحریکوں پر اظہار تشویش کیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس اجلاس میں بائیں بازو کے خلاف ملک گیر مہم چلانے کا ایک خفیہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کے تحت کروڑوں روپے کا فنڈ قائم کیا گیا جس کا بڑا حصّہ پی ایل ۴۸۰ سے دیا جائے گا۔ بقیہ رقم سیٹو میں شامل حکومتیں فراہم کریں گی۔ اس منصوبے کے دائرۂ کار میں پاکستان کے علاوہ ایران اور ترکی بھی شامل ہیں۔ مگر پاکستان پر خصوصی توجہ دینے پر زور دیا گیا ہے۔

لیکن یہ پہلا موقع نہیں، اس سے قبل جب اسی سال جون میں صدر بھٹو مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے دورے پر تھے، تو طہران میں سینٹو کے امریکی ماہرین نے صدر پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ پاکستان میں بڑھتی ہوئی انقلابی سرگرمیوں پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

یہ سی۔ امریکی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ کراچی میں ادیبوں صحافیوں

بائیں بازو کے خلاف خفیہ فنڈ قائم کر دیا گیا

اور طلبہ کے جلوس پر بلا کسی اشتعال کے بے رحمی کے ساتھ لاٹھی چارج کیا گیا۔ اور آنسو گیس استعمال کی گئی۔ یہ جلوس شمالی ویت نام پر امریکہ کی انسانیت سوز بمباری کے خلاف نکالا گیا تھا۔ اس حادثہ کے چند ہی روز بعد کراچی کے مزدوروں پر فائرنگ ہوئی جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۲۲ مزدور شہید ہوئے۔

یہ ظلم و تشدّد امریکہ کی خوشنودی کے لئے کیا گیا تھا شاید اس کا دائرہ اور وسیع کیا جاتا، اور گرفتاریوں کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ لاٹھی چارج اور فائرنگ کے مزید حادثات رونما ہوتے مگر صورتِ حالات نے اچانک ایسا رُخ اختیار کیا کہ ملک کی سیاسی فضا بدل گئی۔ عوام میں ہر طرف غم و غصے کی لہر پھیل گئی۔ حالات حکومت کے قابو سے باہر نکلنے لگے۔

چنانچہ عوامی انقلابی قوتوں کے خلاف اس طریق کار کو بدلنا پڑا۔ اور یہ طے کیا گیا کہ دائیں بازو کی رجعت پسند قوتوں کے تعاون سے ان قوتوں کے خلاف ایک ملک گیر مہم جاری کی جائے اور جب فضا سازگار ہو جائے تو انھیں سختی کے ساتھ کچل دیا جائے۔

اس مہم کا آغاز اس وقت ہوا جب صدر بھٹو نے عوام کے بدترین دشمن اور رجعت پسندوں کے سرغنہ ابوالاعلیٰ مودودی سے لاہور میں ملاقات کی اور مودودی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا:۔

"صدر بھٹو نے کمیونسٹوں کے خلاف جماعت اسلامی کا تعاون حاصل کرنے کی درخواست کی تھی"

مودودی کے اس دعوے کی ہنوز صدر بھٹو نے نہ پیپلز پارٹی کے کسی رہنما نے تردید کی۔ بلکہ اسی دوران مرکزی وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی نے کمیونسٹوں اور انقلاب پسند عوامی قوتوں کیخلاف لائنز کلب میں تقریر کی اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ مودودی کا بیان درست ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ بائیں بازو کی انقلابی قوتوں کے خلاف سینٹو کے اس خفیہ منصوبے کو پاکستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی نہ صرف تائید حاصل ہے بلکہ انہوں نے اپنے سیاسی ایجنٹوں کے ذریعہ اس پر عمل درآمد کرانے کے لئے ہر طرح کی مدد کرنے کی پیش کش کی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سینٹو کے ماہرین کے اس اجلاس میں سرمایہ داروں کے نمائندوں عثمان گنڈا والا اور اشرف تابانی نے بحیثیت مبصرین شرکت کی تھی۔

چنانچہ اس خفیہ منصوبے کے تحت سینٹو کے فنڈ سے ملک کی رجعت پسند جماعتوں کو بڑے پیمانے پر رشوت دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اچانک ملاؤں کو پاکستان میں کمیونسٹوں کا ہوا نظر آنے لگا، اور اُن کے خلاف طرح طرح کے بیانات دیئے جانے لگے۔ حتیٰ کہ جمعیت العلمائے اسلام کے مولانا غوث ہزاروی بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہوگئے۔ حالانکہ وہ رجعت پسندوں میں نہ صرف کم رجعت پسند سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ انتخابات کے دوران اور اس کے بعد بھی سوشلزم کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔

اس سلسلے کا تازہ ترین بیان شاہ احمد نورانی کا ہے جنہوں نے پچھلے دنوں با جماعت پیر پگاڑو کے ہاتھ پر سیاسی بیعت کی اور سندھ کے مظلوم ہاریوں کے استحصال سے حاصل ہونے والی رقم سے ایک طرف تو پیر پگارو اور اُن کے مرید جاگیرداروں کے حق میں بیانات کی توپیں داغنی شروع کیں اور دوسری طرف سینٹو کے فنڈ کی رقم حلال کرنے کے لئے کمیونسٹوں اور عوامی قوتوں کے خلاف مہم شروع کر دی۔

لیکن پیپلز پارٹی جو انتخابات کے دوران بائیں بازو کے ایک متحدہ محاذ کی حیثیت سے اُبھری اور جس نے عوامی قوتوں کے بل بوتے پر نہ صرف انتخابات میں کامیابی حاصل کی بلکہ اقتدارِ مملکت حاصل کیا۔ وہ سینٹو کے اس منصوبے کو قبول کرنے پر کیوں آمادہ ہو گئی؟

اس سلسلے میں سیاسی مبصرین کا خیال ہے کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کو اس صورت حالات میں ڈالنے کی ذمہ داری بڑی حد تک روس اور بھارت پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے پاکستان کے وجود کو ختم کرنے اور چین دشمنی کی خاطر ایک طرف تو پاکستان میں اپنی ہمنوا جماعت نیپ کے ذریعے

الفتح

کمیونسٹوں کا ہوّا کِس کے اشارے پر کھڑا کیا جا رہا ہے؟

اندرونی عدمِ استحکام اور سیاسی انتشار پیدا کرانے کی کوشش کی اور دوسری طرف پاکستان کے مقبوضہ علاقوں کو خالی نہ کر کے اور جنگی قیدیوں کی رہائی کو التوا میں ڈالنے کے لئے طرح طرح کے حیلے پیدا کر کے دونوں ممالک کے درمیان جنگ کے حالات پیدا کر دیئے۔

بھارت اور روس کے ان ہتھکنڈوں کے خلاف اور جنگ کی صورت میں حالات سے نمٹنے کے لئے پاکستان کو سینٹو کے ذریعے امریکہ کی حمایت حاصل کرنی پڑی۔ اس صورتِ حالات سے پیپلز پارٹی کے سابق کنونشن لیگی جاگیرداروں نے فائدہ اُٹھایا، اور یہ کوشش کی کہ حکومت عوامی قوتوں سے کٹ کر امریکی سامراج سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے اور اس طرح پیپلز پارٹی صرف جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کے رحم و کرم پر رہ جائے۔

یہ صورتِ حال نہ صرف تشویش ناک ہے بلکہ پاکستان کے لئے نہایت خطرناک علامت ہے۔ بچا کھچا پاکستان رفتہ رفتہ اسی سیاسی سازش میں ملوّث ہوتا جا رہا ہے جس کے تحت مشرقی پاکستان علیحدہ ہوا۔ وہاں بھی امریکہ نے ایسی ہی سازش کا جال پھیلایا تھا۔ مگر اس نے مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی رجعت پسندوں پر انحصار کیا جو عوام کے اُبھار کے خلاف ایک ہی ریلے میں منتشر ہو گئیں۔ بھارت اور روس نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان کا اثر اسقدر بڑھا کہ امریکہ کو سیاسی طور پر پسپا ہونا پڑا۔ اور یہ حربہ اختیار کیا کہ فوجی کارروائی کے ذریعے مشرقی پاکستان کی بنگلہ قوم پرستی کے سیلاب کو روکا جائے۔ اسی کے اشارے پر جماعت اسلامی اور دوسری رجعت پسند جماعتوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا مگر یہ سیلاب نہ رک سکا۔

انجام کار بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ اور جماعت اسلامی کے ساتھ لاکھوں غیر بنگالی مسلمان بنگالی مسلمانوں کے ہاتھوں تہہ تیغ ہُوئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ جماعت اسلامی کی فسطائی تنظیموں البدر اور الشمس کا حال آج مشرقی پاکستان میں یہ ہے کہ انھیں اس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا جاتا ہے جیسے سندھ میں سوروں کا ہانکا کر کے جاگیردار تفریحِ طبع کے لئے شکار کرتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور اسی قبیل کی دوسری رجعت پسندوں کو مغربی پاکستان میں بھی اپنا یہ انجام سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہ نوشتۂ دیوار ہے۔

سید عبدالحمید عدمؔ



غزل

کیا کہیں — کوئی کام کی شے ہے؟
یا ہر اِک چیز — نام کی شے ہے
غارِ صبو — قہرِ کبریا سے ڈرو
کونسی شے — عوام کی شے ہے؟

لے چلے ہو — تو پھینک مت دینا
دِل بڑے احترام کی — شے ہے
حاکمِ وقت — دیکھتا کیا ہے؟
شوق — ہر خاص و عام کی شے ہے

کوئی مسند پہ — کوئی سُولی پر —!
یہ تمہارے نظام کی — شے ہے
وہ تو انسانیت ہے صِرف — عدمؔ
جو بقائے دوام کی شے ہے

روزانہ سینکڑوں افراد بلا ٹکٹ سفر کرتے ہیں

بولان میل کی ڈائننگ کار سے

اسمگلنگ کا سامان برآمد ہُوا

الفتح رپورٹ

محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی دادو سرکل کو ایک مخبر کے ذریعے اطلاع ملی کہ بولان میل کے ذریعے اسمگلنگ کا سامان لے جایا جارہا ہے چنانچہ اس اطلاع کے پیشِ نظر فوری طور پر ایک پارٹی ترتیب دی گئی اور اچانک بولان میل پر چھاپہ مارا گیا۔ سارے ڈبے کھنگال ڈالے گئے۔ مگر اسمگلنگ کا سامان برآمد نہ ہُوا۔ پولیس نے آخری کوشش کی اور ڈائننگ کار کی تلاشی لینی شروع کی۔ بالآخر اسمگلنگ کا مطلوبہ سامان برآمد کر لیا گیا جس کی مالیت تقریباً پچاس ساٹھ ہزار بتائی گئی۔ اس میں سپاری، غیر ملکی کپڑا اور آرائشِ جمال کا سامان شامل تھا۔

ٹرین کی تلاشی کے دوران پولیس کو چند افراد مشکوک نظر آئے۔ ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو معلوم ہُوا کہ تقریباً انیس مسافر بلا ٹکٹ سفر کر رہے تھے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد سرکل انسپکٹر کی قیادت میں پولیس پارٹی نے ایک سرکاری بس نمبر ۲۴۳۶ پر اچانک چھاپہ مار کر ٹکٹ کی چیکنگ شروع کر دی۔ مسافر بس میں ایک سو سات مسافر سفر کر رہے تھے۔ چیکنگ کے دوران پتہ چلا کہ ۴۸ مسافر بلا ٹکٹ سفر کر رہے ہیں کنڈکٹر اور ڈرائیور نے مِلی بھگت کر کے ۴۸ مسافروں سے نصف کرایہ وصول کر کے ہضم کر لیا اور انہیں بلا ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت دے دی۔

مذکورہ بالا تین واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اِن دنوں ٹرینوں کے ذریعے اسمگلنگ کے کاروبار میں زبردست اضافہ ہو گیا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ریلوے پولیس اور ریلوے کے عملے کا اسمگلروں سے گٹھ جوڑ بتایا جاتا ہے انتظامیہ کے بعض بددیانت افسروں کی حوصلہ افزائی کے بغیر اتنی دیدہ دلیری سے اسمگلنگ کا سامان ادھر سے ادھر کرنے کا اسمگلروں میں حوصلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی کے ایک ذمہ دار پولیس افسر نے ایک اخباری نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا حیرت انگیز انکشاف کیا کہ ریلوے میں بدعنوانیاں بڑھ گئی ہیں۔ ریلوے پولیس اور ریلوے کے چند بااثر افراد مختلف قسم کے جرائم اور بدعنوانیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔

پولیس افسر کے اس سنسنی خیز انکشاف کی روشنی میں جب الفتح کے نمائندے نے سندھ کے چند چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رُکنے والی مسافر گاڑیوں کی چیکنگ کی تو معلوم ہُوا کہ روزانہ سینکڑوں افراد بلا ٹکٹ سفر کرتے ہیں۔ ریلوے پولیس اور ریلوے کے چند افسران مسافروں سے نصف کرایہ وصول کر کے انہیں بلا ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ہر ماہ ریلوے کو ہزاروں روپے کا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

گزشتہ ماہ کینٹ اور سٹی ریلوے اسٹیشن کراچی سے بھی اسی قسم کی اطلاعات ملی تھیں تحقیقات کرنے پر معلوم ہُوا کہ ریلوے پولیس اور ریلوے کے چند افراد داداگیروں سے گٹھ جوڑ کر کے نشستوں کو فروخت کرنے کا غیر قانونی کاروبار کر رہے ہیں۔ ان داداگیروں کو ریلوے کے بعض بااثر افسران کی حمایت بھی حاصل رہتی ہے ریلوے پولیس بھتّے کی موٹی رقم کے عوض انہیں قانون کی گرفت سے دور رکھتی ہے۔ مقامی اخبار کے فوٹوگرافر نے جب ان کی تصویر بنانے کی کوشش کی تو پولیس اور داداگیروں نے مِل کر اخبار کے رپورٹر اور فوٹوگرافر کی زبردست پٹائی کر دی۔

دادو سرکل کے ذمہ دار افسر نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ انہوں نے کوٹری کے قریب بولاری ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک لاکھ روپے کے غبن کا پتہ چلایا۔ سوسائٹی کے چیئرمین اور ڈائرکٹروں کا چالان بہت جلد عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔ انہوں نے بتایا کہ سندھ کے سرکاری محکموں میں غبن، رشوت خوری، خورد برد اور دیگر بدعنوانیوں کا زور بڑھ گیا ہے۔ محکمۂ مال آبپاشی اور پولیس کے متعدد افسران پر محکمانہ تحقیقات کے لیے انسدادِ رشوت ستانی نے منظوری حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ سرکاری محکموں کی کارکردگی گھٹ گئی ہے۔ انہوں نے بدعنوانیوں کے انسداد کے لیے جو بھی قدم اٹھائے اس میں رکاوٹ پیدا کی گئی۔ انہیں روزانہ گمنام خطوط موصول ہو رہے ہیں جس میں انہیں دھمکی دی جاتی ہے کہ وہ بدعنوان عناصر کے خلاف اپنی سرگرمیاں ختم کر دیں۔

موجودہ حکومت نے سرکاری اور نیم سرکاری محکموں سے بدعنوانیاں ختم کرنے اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اصلاح کی غرض سے چند اقدامات کیے۔ ان اصلاحات کے نفاذ سے قبل ہی محبِ وطن افراد نے ان کی اثر انگیزی سے اختلاف کرتے ہوئے اعلان کر دیا تھا کہ ہمارا پورا معاشرہ بدعنوانیوں میں لتھڑا ہُوا ہے۔ جب تک اس کھوکھلے سماج کی گرتی ہوئی عمارت کو توڑ کر دوبارہ تعمیر نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک اس قسم کی لیپا پوتی سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ مگر حکمران طبقہ بضد تھا کہ اس نے جو اصلاحات نافذ کی ہیں، گزشتہ پچیس

سالوں میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ان اصلاحات کے نفاذ سے معاشرے میں ڈائنمک تبدیلی آئے گی۔ عوام نے بھی جو نوکرشاہی اور دوسرے بدعنوان عناصر سے تنگ آئے ہوئے تھے، اس امید میں صبر کیا کہ شاید حکمران طبقہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ ممکن ہے کہ ان اصلاحات کے ذریعے حالات درست ہو جائیں ـــــ مگر صد حیف کہ ان اصلاحات کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہونے دیا گیا، عوام کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔ سرکاری اور عوامی معاملات سے تعلق رکھنے والے محکموں میں بدعنوانیاں بڑھ گئیں۔ چور بازاری، اسمگلنگ، لوٹ کھسوٹ، فرائض سے غفلت اور بے اطمینانی میں ہزار گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ سندھ کے دیہی علاقوں میں لوٹ مار، ڈاکہ زنی رہزنی، قتل، اغوا اور چوری کی وارداتیں، متعدی بیماری کی طرح پھیل گئیں۔ عوام کے شب و روز بے اطمینانی اور پریشانی میں گزر رہے ہیں۔ ادھر حکمران طبقہ سے تعلق رکھنے والے بعض وزراء اسلام آباد کو اندھیرے میں رکھ کر "سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے" کی گردان میں مصروف ہیں۔

لیاقت پور کے بعد کراچی میں ٹرینوں کے حادثات کی بھرمار

نور خان یوسف زئی

یوں تو ریلوے کی تاریخ المناک حادثوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر ورق پر ایک سیاہ حاشیہ لکھا ہوا ہے۔ روہڑی اور تیز رو کے المناک حادثے ابھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں کئی ماؤں کے جگر گوشے اور کئی سہاگنوں کے سہاگ اجڑ گئے۔ کئی لختِ جگر اپنے باپ کا سہارا چھوڑ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں ایسے حادثات ہیں جو روزمرہ ہوتے ہیں اور ان کی اطلاع بسا اوقات ریلوے حکام کو بھی نہیں ہوتی، نہ ہی وہ ان کی طرف دھیان دیتے ہیں۔ معمولی حادثے بڑے المناک حادثوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نمایاں حادثوں میں ۹ر فروری ۱۹۷۲ء کا وہ حادثہ ہے جو لوکل ٹرین نمبر ایل کے ۱۰ ڈاؤن اور مال گاڑی کے درمیان کراچی ریلوے اسٹیشن کے قریب ہوا تھا۔

آئے دن کراچی ڈویژن میں اپ لائن، مین لائن اور شنٹنگ کی جگہوں پر مال گاڑیوں کے ڈبے ریلوے لائنوں سے اتر جاتے ہیں۔ ان کا سدِ باب اب تک نہ ہو سکا۔ آیئے ایک سرسری جائزہ لیں کہ یہ حادثے کس نوعیت کے ہیں۔ یہاں میں اہمیت کے لحاظ سے تازہ ترین واقعہ کا ذکر کروں گا۔ مورخہ ۲ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو کراچی چھاؤنی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک لائن پر مال گاڑی کا ڈبہ نمبر ۵۲۶۷۷ لائن سے اتر گیا۔ اس کے پہیئے زمین میں دھنس گئے۔ اور لائن کے ساتھ ہی سلیپروں کو بھی نقصان ہوا۔ لیکن غفلت اور لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ ۹ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کی شام تک ڈبہ اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑا رہا۔ مرمت اور عملہ کے کام کرنے کے باوجود اس ڈبہ کو لائن پر نہیں لایا جا سکا۔ حالانکہ اس کو لائن پر لانے کے بعد سلیپروں کی تبدیلی اور لائن کی مرمت از حد ضروری تھی۔ مگر ایک ہفتہ گزر جانے تک اس معمولی کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا جا سکا۔ اس حادثہ کے فوراً بعد دوسرے دن یعنی ۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء کو پھر ایک ڈبہ ریلوے لائن سے اتر گیا۔

۸ر اور ۹ر فروری ۱۹۷۲ء کی درمیانی شب کو کراچی شہر کے قریب ایک شنٹنگ انجن لپ لائن پر بنی ہوئی ایک ٹھوکر سے جا ٹکرایا جس سے اس کا بمپر ٹوٹ گیا اور شام تک ناکارہ حالت میں پڑا رہا۔

۸ر مارچ ۱۹۷۲ء کو مین لائن پر کراچی چھاؤنی کے قریب واقع سنٹرل ٹریفک ٹاور ـــــ اپ لائن پر مال گاڑی کے دو عدد ڈبے گر گئے۔ جس سے لائن اُگ ٹوٹی اور سلیپروں کو زبردست نقصان پہنچا۔ ریلوے کو مالی اعتبار سے خاصا خسارہ اٹھانا پڑا۔ اس حادثے کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس دن تقریباً تمام گاڑیاں لیٹ ہوئیں اور ایک سرسری اندازے کے مطابق ایک ہزار منٹ گاڑیاں لیٹ اور تقریباً پندرہ ہزار مسافر اس سے پریشان ہوئے لیکن اگر اوسطاً اندازہ لگایا جائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر ٹرین (مسافر بردار) صرف پندرہ منٹ لیٹ ہوئی تو اس طرح ۱۴۴۰ منٹ تاخیر ہوئی۔

لیاقت پور کے اندوہناک حادثہ کے بعد ایک ہفتہ میں متعدد بار حادثے ہوئے۔ اسی نوعیت کا ایک حادثہ ۱۵ر اگست ۱۹۷۲ء کو ملیر چھاؤنی پر ہوا شنٹنگ کے دوران ایک مضافاتی لوکل ٹرین نمبر ایم کے ۸ ڈاؤن کا انجن پٹری سے اتر گیا اور بارہ بجے دوپہر تک اس واقعہ کی کسی نے خبر بھی نہ لی۔ جب کہ یہ واقعہ تقریباً صبح کے ½۷ بجے ہوا تھا۔

۱۳ر ستمبر ۱۹۷۲ء کو تقریباً ۹ بجے کراچی شہر ریلوے اسٹیشن کی حدود میں ایوریڈی چیمبرس کے قریب ایک انجن نمبر ۳۶۰۵ اور تین ڈبے نمبر ۵۳۸۲۳، ۶۱۹۱۱ اور ۶۱۲۲۴ کو شنٹنگ کر رہا تھا کہ آخری ڈبہ نمبر ۶۱۹۱۱ ریلوے لائن سے اتر گیا۔ اس کا ایک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب اس ڈبہ کو زبردستی ریلوے لائن پر چڑھایا گیا تو اس ڈبے کا "بفر" ساتھ لگے ہوئے ڈبے نمبر ۵۳۸۲۳ پر چڑھ گیا۔ اس زبردست جھٹکے میں دونوں کے "بفر" ایک دوسرے پر اس طرح چڑھ گئے کہ انجن کی مدد سے کافی دور تک چلانے پر بھی وہ علیحدہ نہ ہوئے۔ بعد میں نہ معلوم کس ترکیب سے ان کو علیحدہ کیا گیا ہوگا۔ حالانکہ یہ کام "جیک" کی مدد سے بھی ہو سکتا تھا۔ جب کہ جیک کے استعمال سے دوسرے ڈبے پر ڈبہ چڑھنے کا خطرہ بھی نہ تھا۔

گزشتہ ماہ کراچی شہر کے شیڈ کے قریب پلیٹ فارم نمبر ۵ اور ۶ کے سامنے ایک اپ لائن پر ۴۴ ٹن کی گنجائش کا کھلا ہوا مال گاڑی کا ڈبہ پٹڑی سے اتر گیا۔ حالانکہ اس سے نہ تو ریلوے لائن پر ضرب پڑی اور نہ ہی سلیپر خراب ہوئے تھے صرف خراشیں آئی تھیں لیکن اس سے ایک تو لائن مفلوج ہو گئی اور اس سے آگے مال گاڑی کے دو ڈبے مفلوج ہو کر رہ گئے۔

ظاہر ہے کہ ان حادثات سے ریلوے کو مسلسل مالی بوجھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے لیکن ریلوے کے ارباب حل و عقد ابھی تک ان مسائل کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ ہمیں مکمل یقین ہے کہ اگر ان حادثوں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان حادثوں کا سدِ باب نہ ہو سکے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرض کون ادا کرے؟ ـــــ یہ ڈیوٹی کس کی ہے؟ ـــــ اور یہ افسران کی فوجِ ظفر موج کیا کر رہی ہے؟

قائد اعظم کے گھر میں لاکھوں افراد بے گھر

نعیم الحسن

کراچی جہاں بانیٔ قوم... قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے۔
کراچی۔ پاکستان کا پہلا دارالخلافہ۔
کراچی۔ بین الاقوامی بندرگاہ اور فضائی مستقر
کراچی۔ صنعتی اور کاروباری سرگرمیوں کا اہم مرکز
کراچی۔ قومی آمدنی میں ۶۰ فیصد حصہ ادا کرنے والا شہر، بڑی بڑی کشادہ شاہراہوں، عالیشان عمارتوں، ہوٹلوں، نشاط گاہوں شاپنگ سنٹروں، سینماؤں، نئے نئے ماڈل کی کاروں، جدید طرز کی کوٹھیوں ساحل سمندر کی جھاگ اڑاتی لہروں، شفق کی روشنی میں ڈوبی ہوئی رنگین شاموں، لہراتے ہوئے آنچلوں، شناء اللہ کی ساڑیوں، دہکتے مہکتے ہوئے گلابی جسموں کے شہر —— کراچی میں کوئی مظلوم مسلسل بے روزگاری سے تنگ آکر گلے میں پھندہ ڈال کر خودکشی بھی کر لیتا ہے۔ کوئی مجبور مریض دوا کے حصول میں ناکام ہونے کے بعد مایوسی کے عالم میں کسی فٹ پاتھ کے گوشے میں دم توڑ دیتا ہے۔ تنگ و تاریک جھگیوں میں کیڑے مکوڑے کی طرح رینگتی ہوئی زندگی کو مصائب اور مشکلات کی تاریکی ڈس لیتی ہے۔

کراچی کے حسین ترین اور متمول دل میں مایوسی، ناکامی، گمنامی اور محرومی کی ایک دنیا بھی آباد ہے۔ اس تاریک دنیا کا کراچی کے اس روشن اور خوشحال دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کی صبح و شام میں رنگینیاں سمٹی ہوئی ہیں۔ قائد اعظم کے گھر میں لاکھوں افراد بے گھر ہیں، خانہ بدوش ہیں، مجبور ہیں، بیمار ہیں اور اپنی زندگی سے مایوس ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے وطن کی تعمیر و ترقی میں اپنا سب کچھ لٹا دیا، نچھاور کر دیا۔ تاریخ کی بے مثل قربانیاں دیں۔ انہی کی قربانیوں سے قائد اعظم کا خواب حقیقت کے روپ میں ڈھل کر چمن زار بنتا رہا۔ دھندلے دھندلے خاکے میں قوس و قزح کے رنگ بھرتے گئے۔ کراچی ایشیا کا خوشحال اور متمول شہر بن گیا۔ مگر ان کی دنیا تاریک اور سکڑتی گئی۔ جن کے ہاتھوں کی مسلسل حرکت نے اسے خوب سے خوب تر بنا دیا۔

یہ اس عظیم شہر کا المناک پہلو ہے، جسے سیاستدان اور صنعت کار گذشتہ ۲۵ سالوں سے مسلسل ایکسپلائٹ کر کے اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔

کراچی کے رنگ و روپ نکھارنے والے محنت کش عوام ہیں یہی اس کے اصلی خالق ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ہند کے وقت منگھوپیر کے صنعتی علاقہ میں صرف دو کارخانے تھے، محنت کشوں کے ہاتھوں کی مسلسل گردش سے اس علاقہ میں سینکڑوں کارخانے اور ملوں کی عمارتیں اُبھر آئی ہیں۔ ایک نہیں سینکڑوں مشینوں کا پہیہ رات دن تیزی سے گھوم رہا اور شہر کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا ہے۔

کراچی کی بہت بڑی آبادی شہر سے کافی فاصلے پر چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک کوارٹروں، جھگیوں اور بنیادی وسائل سے محروم گوٹھوں میں رہتی ہے۔ ان کالونیوں میں پینے کا پانی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ سڑکیں نامکمل اور انتہائی بیہودہ ہیں۔ آمد و رفت کا معقول انتظام نہیں۔ روشنی اور اسکول کا وجود نہیں، گندے پانی گلیوں اور گرد و غبار سے اٹی ہوئی سڑکوں پر بہتے ہیں جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ہیں جہاں چپراسیوں اور مزدوروں کے بچے گولیاں اور گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے بالغوں کی طرح فحش گالیاں بکتے ہیں۔ کالونیوں میں ہسپتال، میٹرنٹی ہومز، مارکیٹ، اسکول اور پارکوں کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ ان علاقوں میں کراچی کے اصل خالق رہتے ہیں۔ جن کے دم سے الفی کی شامیں سجتی ہیں۔ اور دہکتے مہکتے جسموں میں لہو تیزی سے گردش کرتا ہے۔

کراچی میں بے پناہ مسائل ہیں، ان مسائل کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا۔ اس لئے یہ روز بروز سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ یہاں رہنے والوں کو ہر قدم پر نئے مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس سے ان کی زندگی عذاب بن گئی ہے۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق کراچی کے شہریوں کو مندرجہ ذیل مشکلات کا سامنا ہے۔

۱۔ بے گھر افراد کی مستقل آبادکاری۔
۲۔ پانی کی کمی۔
۳۔ تعلیمی درس گاہوں کی تعداد میں کمی۔
۴۔ طبی سہولت کا فقدان۔
۵۔ روزمرہ کی آمد و رفت میں مشکلات اور غیر تسلی بخش انتظام۔
۶۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ افراد کی بیروزگاری۔
۷۔ محنت کشوں کے مسائل سے شرمناک چشم پوشی۔
۸۔ بلدیہ، میونسپلٹیوں اور ٹاؤن کمیٹیوں کی ناقص کارکردگی۔

کراچی کے غریب طبقہ اور مہاجرین کی آبادکاری باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت نہیں کی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق ابھی تک تقریباً ڈھائی لاکھ افراد گندی اور تنگ و تاریک جھگیوں میں رہتے ہیں۔ غربت اور افلاس کے مارے ہوئے لوگوں کے سامنے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ وہ غیر انسانی زندگی بسر کریں۔ انہیں زندگی کی کوئی بنیادی سہولت حاصل نہیں ہے۔ حکومت نے اب تک بے گھر افراد کی آبادکاری کے سلسلہ میں جو قدم اٹھائے ہیں، انہیں نامکمل اور ناقص ہی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان آبادکاریوں سے آبادکاری کا مسئلہ حل ہونے کی بجائے سنگین بن گیا۔ غریب اور محنت کش طبقے کو شہر سے باہر ایسی کالونیوں میں پھینک دیا گیا جہاں بجلی، پانی، آمد و رفت، اسکول، ہسپتال اور روزگار جیسے بنیادی وسائل موجود نہیں ہیں۔ جس سے ان کالونیوں میں رہنے والوں کی زندگی ایک مستقل عذاب بن گئی ہے۔ ان کوارٹرس کی تعمیر مہاجر فنڈ اور بعض ملکوں کی مالی اور فنی امداد و تعاون سے ہوئی ہے۔ لیکن الاٹیوں سے جبراً اصل لاگت سے زیادہ قیمتیں وصول کی جا رہی ہیں۔ جن کی ادائیگی اس طبقے کے وسائل سے باہر ہے۔ ان کالونیوں کی تعمیر میں آبادکاری کے محکمے اور

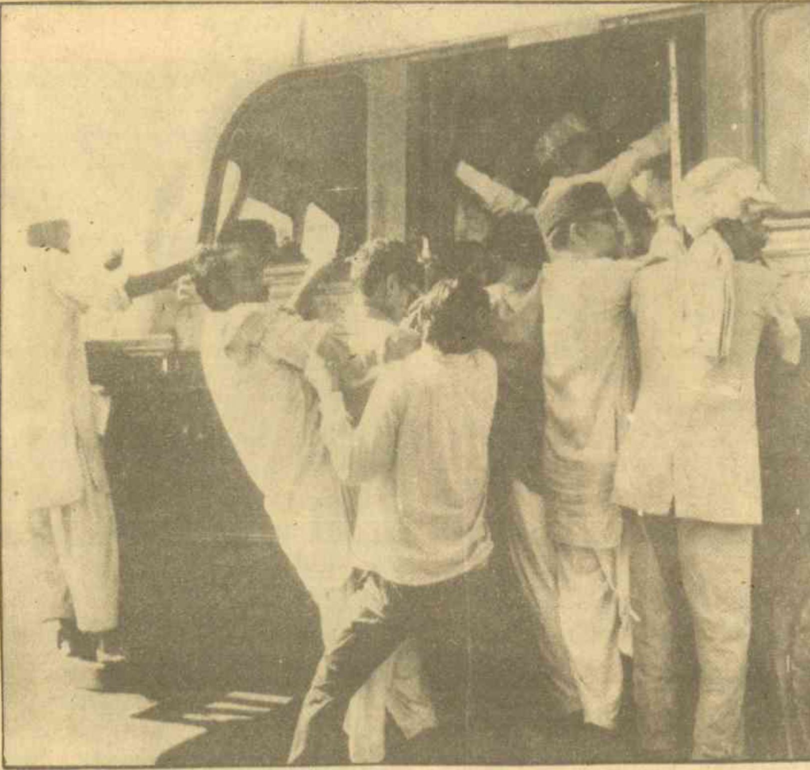
ڈھائی لاکھ افراد تنگ و تاریک جھگیوں میں رہتے ہیں۔

کراچی —— ظلمتوں کا شہر









گرمی کے دنوں میں پانی بند کر کے کراچی کو کربلا بنا دیا جاتا ہے

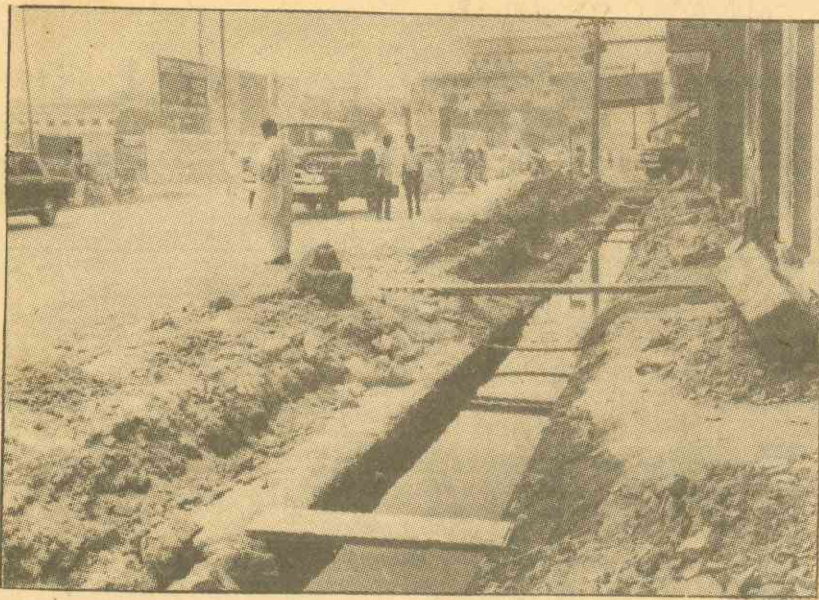
ٹھیکیداروں نے خوب دولت لوٹی۔ کوارٹروں میں ناقص سامان لگایا گیا۔ اور ان کی تعمیر اس طرز پر کی گئی ہے کہ پہلی نظر میں یہ گھوڑدوڑ کے اصطبل دکھائی دیتے ہیں۔ گندے پانی کے نکاس کا کوئی انتظام نہیں جس کی وجہ سے کراچی کی تمام نواحی کالونیاں گٹر کے سڑے ہوئے بدبودار پانی میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ ادارہ ترقیاتِ کراچی نے اب تک جتنی کالونیاں تعمیر کروائی ہیں ان کا حشر ہمیشہ خراب ہی ہوا ہے۔

کراچی کا دوسرا بڑا مسئلہ پینے کے پانی کی کمی ہے۔ گرمی کے دنوں میں عام طور پر پانی کی سپلائی کی مقدار میں کمی کر دی جاتی ہے، اعلیٰ اور نفیس قسم کی کالونیوں اور سوسائٹیوں میں پانی کی سپلائی میں شاذونادر فرق آتا ہے۔ البتہ کورنگی، لانڈھی کھوکھراپار، سعود آباد، ڈرگ روڈ، ملیر، نیو کراچی، بلدیہ کالونی، قصبہ کالونی، آگرہ تاج کالونی، بہار کالونی، محمود آباد اور اورنگی ٹاؤن میں کئی کئی روز پانی کی سپلائی بند رہتی ہے۔ جس سے مذکورہ کالونیوں میں محشر کا سا سماں دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کالونیوں کے باشندے کئی کئی روز پانی کے قطرے قطرے کے لئے ترس جاتے ہیں۔ جبکہ بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہنے والے پانی ضائع کرتے ہیں۔ ادارہ ترقیات کے محکمہ آب رسانی نے کئی بار اعلان کیا کہ آئندہ سال سے پانی کی کمی کی شکایت ختم ہو جائے گی۔ اور کالونیوں کو ان کی ضرورت کے مطابق پانی ملنے لگے گا۔ مگر اس قسم کے خوش آئند اعلانات کا ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ کراچی کا درمیانہ اور محنت کش طبقہ گرمی کے ایام میں پانی کی آرزو میں تڑپنے لگتا ہے

تیسرا بڑا مسئلہ طلبہ کی تعداد کے مقابلے میں تعلیمی اداروں کی قلت اور تعلیم کا پست معیار ہے۔ ۹۸ فی صد تعلیمی ادارے شہر میں واقع ہیں۔ جبکہ مذکورہ بالا کالونیوں میں سرے سے تعلیمی ادارے موجود ہی نہیں۔ اکا دکا تعلیمی ادارے خالص کمرشیل بنیادوں پر چل رہے ہیں۔ اور غریب باشندوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ نواحی کالونیوں میں تعلیمی اداروں کی کمی، ناقص کارکردگی اور فیسوں میں زیادتی کے سبب غریب بچے تعلیم سے محروم ہیں۔ قارئین کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ نیو کراچی کی آبادی چھ لاکھ ہے۔ لیکن اتنی بڑی آبادی کے لئے ایک بھی سرکاری ثانوی اسکول نہیں ہے۔ ابھی حال ہی میں جن پرائمری اسکولوں کو سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے ان کی انتظامیہ زبردستی بچوں سے فیس وصول کر رہی ہے۔ اور ضرورت مند بچوں کو داخلہ دینے سے انکار کیا جا رہا ہے حکومت کے اس اقدام سے غریب والدین کو سہولت حاصل ہونے کی بجائے انتظامیہ کی سازشوں سے ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس ضمن میں محکمہ تعلیمات نے ابھی تک کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا اور محض پریس بیانات اور اعلانات پر تکیہ کیا جا رہا ہے۔

اس عظیم صنعتی شہر میں رہنے والے محنت کشوں کا چوتھا بڑا مسئلہ..... ٹرانسپورٹ ہے۔ ۲۰ سال گزرنے کے بعد بھی یہ مسئلہ روزِ اول کی طرح سنگین ہے۔ صبح و شام شہریوں کو پرائیویٹ بسوں اور کھڑکھڑاتی دھواں اڑاتی اومنی بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس کر سفر کرایا جاتا ہے۔ بس اسٹاپوں پر گھنٹہ گھنٹہ انتظار کے باوجود ہاتھ نہیں آتیں۔ اور جو نظر آتی ہیں تو وہ محبوب کی طرح عشوے اور غمزے دکھاتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ یہ مسئلہ بھی غلط اور ناقص پلاننگ کا پیدا کردہ ہے۔ یہ کالونیاں شہر سے کافی دور تعمیر کی گئیں۔ اور ٹرانسپورٹ کا باقاعدہ انتظام نہیں کیا گیا





نواحی کالونیوں کی تعمیر میں ٹھیکیداروں نے خوب دولت کمائی

جس کی وجہ سے ان علاقوں کے باشندوں کے لئے ٹرانسپورٹ ایک مستقل اور پیچیدہ مسئلہ بن گیا۔ سرکاری بسوں یعنی اومنی بسوں کی کارکردگی انتہائی ناقص ہے۔ چند روٹوں پر ان کی اجارہ داری ہے۔ شہر کے دوسرے روٹوں پر پرائیویٹ بسوں کی اجارہ داری ہے۔ اس اجارہ دارانہ طریقہ کار سے شہر کے مختلف روٹوں پر کم سے کم بسیں چلا کر زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ سرکاری ٹرانسپورٹ اپنی انتہائی ناقص کارکردگی کے سبب عوام کی ضرورت پوری کرنے میں بالکل ناکام ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں سرکاری ٹرانسپورٹ میں غبن خورد برد، فاضل پرزوں کی چوری اور پیٹرول کی چوری کے واقعات عام ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے اسٹاپوں کے مسافروں کو ٹکٹ جاری نہیں کئے جاتے اور مسافروں سے کرایہ وصول کر کے کنڈیکٹر اپنی جیب میں رکھ لیتے ہیں۔ سویڈن اور دوسرے ملکوں سے آنیوالی بسوں کی حالت چھ ماہ کے اندر اندر بگڑ گئی۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر بسوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ نہ ہی پہلے سے موجود بسوں کی کارکردگی پر کوئی نظر رکھی جاتی ہے۔ پرائیویٹ بسوں کے مالکان کو چند روٹوں پر مکمل اجارہ داری دیکر انہیں مسافروں کو لوٹنے اور پریشان کرنے کی کھلی چھٹی دیدی گئی۔

بیروزگاری۔ کراچی کا سب سے بڑا اور سنگین مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعہ حل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ صنعتی اور کاروباری شہر ہونے کے باوجود تعلیم یافتہ افراد کی کھپت نہیں ہوتی۔ ہر سال بیروزگاروں کی کھیپ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ قارئین کو سن کر حیرت ہوگی کہ ۱۹۶۷ء کے میٹرک اور انٹر کے کامیاب طلبہ ابھی تک بیروزگار ہیں اس کے علاوہ ہر سال اندرونِ ملک سے بے روزگاروں کی ایک بڑی تعداد روزگار کے حصول کے لئے کراچی آتی ہے۔ اور خوار ہوتی ہے۔ دفتر روزگار بے روزگاروں کے نام اور پتے درج کر کے کارڈ جاری کرنے پر اکتفا کرتا ہے، روزگار فراہم کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں دفتر روزگار کے ایک نمائندے سے بات کی گئی تو انھوں نے بڑی راز داری سے کہا ..... "یہ ذمہ داری وزارا اور سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسرں نے سنبھال رکھی ہے۔ یہاں تک نوبت پہنچتی ہی نہیں، ان لوگوں سے بچ رہنے والی آسامیاں سفارش اور رشوت سے پُر کی جاتی ہیں۔"

دفتر روزگار کے نمائندے کے جواب کی روشنی میں اگر اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے تو اس کے خطرناک پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ ہر سال اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی سے کامیاب ہونیوالے طلبہ اور مختلف سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ کاروباری اداروں میں خالی ہونیوالی آسامیوں کے درمیان کوئی مناسبت ہے۔ اور نہ ربط، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی میں بیروزگاروں کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ جو کسی وقت ایک بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

کراچی کے شہروں کو طبی امداد کے حصول میں زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شہر کے دو بڑے ہسپتال کے وسائل مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ نواحی علاقوں میں منظم طبی اداروں کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔ بلدیہ میونسپلٹی اور ٹاؤن کمیٹیوں کے تحت چلنے والے طبی مراکز کے وسائل اور کارکردگی اس قدر مایوس کن ہے کہ عوام علاج کی بجائے موت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ نواحی علاقوں کے مریضوں کو سول اور جناح ہسپتال کے لئے طول طویل فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ جس سے ان کے مرض میں آفاقہ ہونے کی بجائے اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ ان ہسپتالوں میں ان کا تسلی بخش علاج ہو سکے۔

مقامی مسائل کی دیکھ بھال کرنے والے سرکاری ادارے پورٹ ٹرسٹ، بلدیہ، ادارۂ ترقیات، میونسپلٹیوں اور ٹاؤن کمیٹیوں کے درمیان کو رابطہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان محکموں میں اقربا پروری، رشوت ستانی، غبن، خورد برد، کاہلی اور دیگر اخلاقی برائیاں مضبوطی سے جڑ پکڑ چکی ہیں جنکی وجہ سے یہ ادارے غیر موثر ہو چکے ہیں۔ قارئین کے لئے یہ انکشاف حیرت انگیز ہوگا کہ کیماڑی پل ایک عرصہ سے مرمت طلب ہے، گذشتہ کئی سالوں سے ہر محکمہ اس کام کو دوسرے محکمے پر ٹالتا چلا آرہا ہے۔ اسی طرح شہر کے کئی علاقوں میں ترقیاتی پروگرام محض اس وجہ سے رکے پڑے ہیں کہ مختلف ترقیاتی محکموں کے درمیان ابھی تک یہ تصفیہ نہیں ہو سکا کہ اس کام کی اصل ذمہ داری کس محکمے پر عائد ہوتی ہے۔ فائلوں اور نوٹس کا تبادلہ جاری ہے۔ مسئلے کو نمٹانے میں ابھی کئی سال درکار ہوں گے۔

کراچی جیسے عظیم صنعتی کاروباری اور متمول شہر میں مذکورہ بالا مسائل کے علاوہ اور بھی بے شمار سنگین مسائل موجود ہیں؛ ان تمام مسائل کا براہ راست تعلق نچلے متوسط اور محنت کش طبقے سے ہے، شائد اسی لئے آج تک ان کے حل پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ اگر ان کا تعلق معاشرے کے نام نہاد اعلیٰ طبقہ سے ہوتا تو کبھی کے حل کر دیئے جاتے۔ اور شکایتوں کا ازالہ کر دیا جاتا۔ قائد اعظم کی اس پیدائشی جگہ میں قائد کے خواب میں حقیقت کا رنگ بھرنے والوں کی اپنی زندگی بے رنگ اور پھیکی بن چکی ہے۔ گوناگوں اور پیچیدہ مسائل نے ان کی زندگی کو مسلسل رسنے والا پھوڑا بنا دیا ہے۔ وہ سیاست کی ہر تبدیلی میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کرتے اور پھر کچھ دنوں کے بعد مایوسی اور ناکامی کے انبار میں اپنے آپ کو دفن کر لیتے ہیں۔ دیکھئے ان کی مشکلات کی رات کب ختم ہوگی اور نئی صبح کا سورج کب طلوع ہوگا؟

افسانہ

محمد افضل جنجوعہ

"ہم فیس نہیں لیتے یہ تو امدادی چندہ ہے۔ جو نہ دے اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے"

نئے خواب کی تعبیر

اللہ دتہ شام کو کام دھندے سے فارغ ہو کر تھکا ماندہ واپس آیا تو اس نے سوچا۔ رات کے لیے کالے خان کھوکھے والے سے لیمپ کی آدھی ڈبی خود ہی لیتا چلوں۔ اسماعیل اندھیرے میں کہاں آتا پھرے گا۔

ماسٹر رمضان اور منشی نور الٰہی کھوکھے کے سامنے بچھے ہوئے بینچ پر بیٹھے گرما گرم بحث میں مصروف تھے۔ اللہ دتے کو غور و خوض کے باوجود وہ بات تو سمجھ نہ آسکی جس پر وہ جھگڑ رہے تھے۔ البتہ وہ یہ ضرور جان گیا کہ آج کوئی نئی تازہ خبر آئی ہے۔ جب بھی اخباروں میں کوئی نئی اور اہم خبر آتی تو منشی نور الٰہی اور ماسٹر رمضان میں اسی طرح جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ ماسٹر رمضان کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ہائی اسکول میں ساتویں جماعت کو حساب پڑھاتے ہیں، ادھر منشی صاحب بھی اپنے آپ کو ارسطو سے کم نہ سمجھتے تھے اور اکثر اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا کرتے تھے کہ اگر میں مشورے نہ دیا کروں تو اپنے وکیل صاحب دو ہی مہینوں میں مقدموں کا کاروبار چھوڑ کر آٹے دال کی دکان کھول لیں۔

اللہ دتہ سگریٹ لینے کے بعد کافی دیر تک کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب اس کے پلّے کچھ نہ پڑا تو آخر اس نے پوچھ ہی لیا —— "باؤجی! آج کیا خبر ہے؟"

"ارے تجھے ان باتوں سے کیا —— تو آرام سے برتن قلعی کیا کر!" منشی نور الٰہی نے اپنا کمبل ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ شاید ماسٹر رمضان اس دن منشی صاحب کو ہر میدان سے بھگا دینے کا ارادہ کیے ہوئے تھے یا پھر اللہ دتے کی سادہ لوحی ان کے دل پر اثر کر گئی تھی۔ انہوں نے توقع کے بالکل برعکس اللہ دتے کو سمجھاتے ہوئے کہا —— "اللہ دتے! گورنمنٹ یعنی اپنی حکومت نے پرائمری ایجوکیشن، میرا مطلب ہے پانچویں جماعت تک پڑھائی فری، یعنی بالکل مفت کر دی ہے!"

"ہیں! سچ باؤجی ... ؟" اللہ دتے نے حیران ہوتے ہوئے مزید تصدیق چاہی۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟" ماسٹر نے جواب دیا۔

اللہ دتے کے دل کے ایک کونے میں مجبوریوں کے احساس کے بوجھ تلے دبی ہوئی ایک معصوم سی آرزو پہلو بدلنے لگی اور اسے نظریۂ پاکستان، آزادی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے الگ ملک کے نعرے کا کچھ کچھ مفہوم سمجھ میں آنے لگا۔ پھر یکایک اسے ایسے محسوس ہوا جیسے یک لخت بہت سی آرزوؤں اور تمناؤں نے اس کے دل میں جنم لے لیا ہو۔

اللہ دتے نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اسماعیل ابا جی ..... ابا جی۔ کہتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اللہ دتے کی دن بھر کی تھکاوٹ دور ہو گئی۔ اس نے بوری جس میں کوئلے اور دھونکنی تھی دور پھینکی۔ کھٹی اپنی بیوی کو تھما دی۔ سر سے اوزاروں کا ڈبہ اتار کر زمین پر رکھ دیا۔ اسماعیل کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کا میلا کچیلا منہ چوم لیا اور اسے گود میں لے کر چولہے کے سامنے مونڈھے پر بیٹھ گیا اس کی بیوی نے پوچھا —— "کیا بات ہے؟ کاکے کے ابا! آج تم بہت خوش ہو!"

بیوی کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے اللہ دتے نے کہا —— "فاطمہ! بھلا کاکے کی عمر کتنی ہے؟"

"یہی کوئی چھ برس سے اوپر ہی ہوگی!" فاطمہ نے جواب دیا۔

اللہ دتہ انگلیوں پر گنتی کر کے حساب لگانے لگا کہ کاکا کتنے سال کی عمر میں دسویں جماعت پاس کرے گا اور اس کے جوان ہونے میں ابھی کتنے سال باقی ہیں پھر یکایک اسماعیل کو چومتے ہوئے اللہ دتے نے کہا —— "فاطمہ! میں کاکے کو پڑھنے میں لگا دوں گا۔"

"اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟" فاطمہ نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔

"اری پگلی! تجھے پتہ نہیں کہ تعلیم مفت ہو گئی ہے۔ انہی باتوں کے لیے تو پاکستان بنایا گیا تھا۔ اسی لیے تو ہم گلی کوچوں میں نعرے لگایا کرتے تھے "لے کے رہیں گے پاکستان" —— اب کوئی گوروں کا راج تھوڑا ہی ہے جو صرف امیروں کے بچے پڑھیں اب تو ہمارے اپنے دیس میں ہماری اپنی حکومت ہے۔" اللہ دتے نے اپنی بیوی پر اپنے علم کی دھونس جماتے ہوئے کہا۔

اللہ دتے نے اسماعیل کو صبح سویرے ہی جگا دیا۔ نورے نائی کو بلا کر اس کی حجامت بنوائی، ناخن ترشوائے اور پانی گرم کر کے اسے نہلایا۔ پاپلین کی نئی قمیض اور لٹھے کی نئی شلوار جو عید کے لیے ابھی

الفتح

کے واسطے سلوائی گئی تھی، اسے پہنا دی۔ اس کے بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی، اور آنکھوں میں سُرمہ لگا دیا۔

اسماعیل نے کہا —— "ابا مجھے تو پالا لگ رہا ہے!"

"بیٹا! اگلے ماہ مَیں تمہیں کوٹ بھی لے دوں گا۔ لے ابھی تو میرے والا سوئٹر قمیض کے نیچے پہن لے، مجھے بہت تنگ ہے!"

اللہ دتے نے اپنا سوئٹر اتار کر اسماعیل کو پہنا دیا اور ٹرنک سے اس کے کپڑے کے بوٹ بھی نکال کر دے دیئے۔

فاطمہ روٹی پکانے میں مصروف تھی۔ ایندھن لینے آئی تو اسماعیل کو نئے کپڑے پہنے دیکھ کر خوش ہو گئی اور بولی —— "آج کاکا کتنا پیارا لگتا ہے!"

اللہ دتے نے جھٹ سے اسماعیل کے ماتھے پر سُرمے سے "بندی" لگا دی جس سے بچے کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

فاطمہ بولی —— "اگر "نظر" نہیں لگنی تھی تو اب لگ جائے گی۔ "بندی" لگانے سے "کاکا" اور بھی پیارا لگتا ہے!"

فاطمہ بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں گئی اور چار پانچ سُرخ مرچیں لے آئی۔ ان مرچوں کو ڈنڈیوں سے پکڑ کر اسماعیل کے سر پر گھمانے لگی۔ سات "چکر" دلا کر اس نے مرچوں کو چولہے میں جھونک دیا اور یوں تسلی کر کے بولی —— "اب کاکے کو نظر لگانے والے کی نظر ہی جل جائے گی۔ اللہ میرے لال کو بُری نظر سے محفوظ رکھے۔"

اللہ دتے نے بازار سے اسماعیل کے لیے ایک چھوٹی تختی، سرکنڈے کے تین چار قلم، کالی سیاہی کی دو پُڑیاں، ایک دوات اور ایک قاعدہ خریدا، اور بچوں کے اسکول کا پتہ پوچھ کر اسماعیل کو ساتھ لیے خوشی خوشی وہاں جا پہنچا۔ جب اسکول کی ہیڈ مسٹریس نے اسے بتایا کہ یہ نئی طرز کا اسکول ہے اور یہ کہ اس اسکول میں پانچ روپے داخلہ اور دس روپے ماہوار سے کم فیس نہیں لی جاتی۔ تو اسے بہت صدمہ ہوا۔

وہ جلد ہی ایک دوسرے سکول جا پہنچے۔ باہر لکھا تھا —— "پاک رائل سر سید ماڈرن کالج فار چلڈرن"، اس اسکول کی عمارت بڑی شاندار تھی اور بچے بھی بڑے پیارے تھے۔ سبھی بچوں نے لال رنگ کے کوٹ اور کالی پتلونیں پہن رکھی تھیں۔ ان کو لانوں میں گھومتے اور کھیلتے ہوئے دیکھ کر اللہ دتے کی طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس نے جی میں فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور اسماعیل کو اسی اسکول میں داخل کروائے گا۔

اللہ دتہ اسماعیل کو انگلی لگائے اندر جانے لگا تو گیٹ پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے یہ کہتے ہوئے اسے روک لیا —— "ابے کہاں گھسے جا رہا ہے؟"

"اس بچے کو داخل کروانا ہے!"، اللہ دتے نے جواب دیا۔

چوکیدار زخمی کرنے والے انداز میں مسکرانے لگا اور بولا —— "بھائی! تیری عقل ٹھکانے ہے؟ بھلا اسے کون یہاں داخل کرے گا؟"

"کیوں —— ؟" اللہ دتے نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

یہاں بڑے بڑے آدمیوں کے بچے پڑھتے ہیں اس اسکول میں تیرے میرے بچے نہیں پڑھ سکتے، ہم لوگ ان اسکولوں کا خرچ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں؟"

"لیکن اب بڑے چھوٹے کا سوال کیوں؟ حکومت نے تعلیم تو مفت کر دی ہے؟"

چوکیدار نے سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن اللہ دتہ اندر چلا گیا۔ جب دفتر والوں نے اللہ دتے کو اسکول میں داخلہ کے قواعد و ضوابط سنائے اور اخراجات کی تفصیل بتائی تو اس نے جی میں کہا چوکیدار واقعی ٹھیک کہتا تھا۔

چوکیدار نے اللہ دتے کو مایوس ہو کر باہر نکلتے دیکھا تو اس نے ازراہِ ہمدردی کہا —— "بھائی میرے خیال میں اب تو تیری تسلی ہو گئی ہوگی۔ اگر میری مانو تو اپنے بچے کو کمیٹی کے کسی اسکول میں لے جاؤ وہاں شاید کسی کو رحم آ جائے۔ ورنہ امیر آدمیوں کے بچوں کے ان اسکولوں میں تیرے بچے کو کون داخل کرے گا؟"

اللہ دتے کے دل کو ایک دھچکا سا لگا اور وہ سوچنے لگا کہ یہ اسکول عجیب ہیں جہاں غریب بچوں کو داخل ہی نہیں کیا جاتا۔

تھوڑی دیر بعد میونسپل کمیٹی کے اسکول میں اللہ دتہ بار بار التجا کر رہا تھا —— "خدا کے لیے میرے بچے کو داخل کر لیجئے۔۔۔!"

"مسٹر اپنا وقت ضائع نہ کرو، ہمارے پاس جگہ ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں پہلے ہی بہت زیادہ لڑکے ہیں۔ آپ اسے گورنمنٹ پرائمری سکول میں لے جائیں وہاں تعداد کم ہے!"، ہیڈ ماسٹر صاحب نے اللہ دتے کو باہر کا راستہ دکھاتے ہوئے کہا۔

اللہ دتہ راستے میں اسماعیل کو بار بار کوستا تھا کہ وہ تیز چلے لیکن اسماعیل کوشش کے باوجود پیچھے رہ جاتا تھا لوگوں سے گورنمنٹ پرائمری سکول کا پتہ پوچھ کر وہ جلد ہی وہاں جا پہنچے۔

"کیسے آئے ہو —— ؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کچھ

"الفتح" کی اشاعتِ خاص کی قیمت میں کمی!

قارئین کے بعض حلقوں نے شکایت کی تھی کہ مہنگائی کے اس دور میں اشاعت خاص کی قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے زیادہ ہے۔ نیوز پرنٹ کی قلت اور اس پر وزارتِ اطلاعات کی طرف سے الفتح کے ساتھ جانب دارانہ برتاؤ، سرکولیشن کو آڈٹ کرنے سے دانستہ گریز، الفتح کی مقبولیت میں بے پناہ اضافے نے جو مالی مشکلات پیدا کر دی ہیں اس صورت میں ۶۰ صفحات کے ایک شمارہ کی قیمت ایک روپیہ پچیس پیسے مناسب تھی، تاہم الفتح قارئین کا پرچہ ہے۔ ان کی شکایت کے پیش نظر اس شمارہ سے اشاعتِ خاص کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ عام شمارہ کے بارے میں قارئین اپنی رائے سے مطلع فرمائیں کہ صفحات کم کر دیئے جائیں یا قیمت میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس وقت جو جرائد شائع ہو رہے ہیں، ان میں سے اکثر کے صفحات کی تعداد ۲۴ اور قیمت ۷۵ پیسے ہے جب کہ الفتح کے صفحات کی تعداد ۳۶ اور قیمت ۵۰ پیسے ہے۔ فیصلہ بہر حال قارئین کو کرنا ہوگا —— (ادارہ)

اس طرح سے پوچھا جیسے کوئی تھانیدار تفتیش کر رہا ہو ——— !

"حضور! اس بچے کو داخل کروانا ہے!"

"باہر بورڈ نہیں پڑھا ——— ؟"

"جی ... مَیں پڑھا لکھا نہیں ہوں!"

"تو سنیئے! ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں اس لیے ہم نے باہر بورڈ لکھ کر لگا دیا ہے کہ "کوئی صاحب بچوں کو داخل کروانے کے لیے تشریف نہ لائیں۔ آپ اپنے بچے کو کسی انجمن کے سکول میں لے جائیے ..... ہمارے ہاں بالکل گنجائش نہیں!"

اللہ دتہ ابھی دفتر کے باہر ہی کھڑا تھا کہ ایک صاحب کار سے اتر کر تین بچوں کو ساتھ لیے اندر آئے ہیڈ ماسٹر صاحب ان کو دیکھ کر احترام کے لیے کھڑے ہو گئے اور بولے ——— "میاں صاحب! آپ نے خود تکلیف کیوں فرمائی، نوکر ہی کو بھیج دیا ہوتا!"

"کوئی بات نہیں، آپ انہیں داخل کر لیجیے اور مہربانی کر کے ایک گھنٹہ انہیں گھر آ کر بھی پڑھا جایا کریں!" میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا جناب! ہم تو آپ کے خادم ہیں ——— !" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔

...... اور اللہ دتے کے کانوں میں ان کے یہ الفاظ ایک بار پھر گونج گئے ——— "بالکل گنجائش نہیں" اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے بچے کا گلا گھونٹ دیا ہو۔

اس سکول میں بھی کام نہ بنا تو باپ بیٹا ایک انجمن کے اسکول میں جا پہنچے۔ یہاں بھی سامنے تختۂ سیاہ پر چاک سے لکھا ہوا تھا ——— "ہمارے ہاں داخلہ بند ہے!" نیچے باریک لفظوں میں درج تھا ——— "اگر کسی صاحب نے اپنے بچے کو ضرور داخل کروانا ہو تو وہ ماسٹر رحمت الٰہی سے ملیں!"

اللہ دتہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں جانے کے بجائے ماسٹر رحمت الٰہی کو ڈھونڈنے لگا۔ لڑکوں نے اسے بتایا کہ وہ اس وقت تیسری جماعت کے کمرے میں ملیں گے۔ اللہ دتہ تیسری جماعت کے کمرے میں گیا تو ماسٹر صاحب میز پر ٹانگیں دھرے آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھے اونگھ رہے تھے اور ایک لڑکا تختۂ سیاہ پر کچھ لکھ کر لڑکوں کو سمجھا رہا تھا۔ اللہ دتے نے سلام کیا تو ماسٹر صاحب چونکے۔ اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اللہ دتے کے ساتھ اسماعیل کو دیکھ کر وہ معاملے کو بھانپ گئے اور مسکراتے ہوئے بولے ...

..... "داخل کروانا ہے بچے کو ... ؟"

"جی ہاں!" اللہ دتے نے ماسٹر صاحب کی معاملہ فہمی سے خوش ہو کر جواب دیا۔

ماسٹر صاحب جمائی لیتے ہوئے بولے ...

... "دیکھو بھائی! صاف صاف بات کرتا ہوں، داخلہ تو ہمارے سکول میں بالکل بند ہے۔ اگر تم اپنے بچے کو داخل کروانا چاہتے ہو تو بولو انجمن کو کتنا چندہ دو گے؟"

"حضور! میں تو ایک غریب آدمی ہوں!" اللہ دتے نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں امیر اور غریب کا سوال نہیں، یہ تو کارِ ثواب ہے۔ آپ کی دی ہوئی رقم بے کار نہیں جائے گی۔ ملک، قوم اور انسانی بھلائی کے لیے ہی خرچ ہو گی!"

اللہ دتے کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ انسان نہیں ہے اور نہ ہی اس ملک اور قوم سے اس کا کوئی تعلق ہے طویل منت سماجت کے بعد جب اللہ دتے نے دیکھا کہ چندہ دیئے بغیر بات نہیں بنتی تو بولا ——— "اچھا آپ مجھ سے مناسب پیسے لے لیں۔ مَیں غریب آدمی ہوں میرا ایک ہی بچہ ہے۔ مَیں چاہتا ہوں، کہ یہ کچھ لکھ پڑھ جائے۔"

"خیال تو تمہارا بہت اچھا ہے۔ بہرحال سوچ لو، کوئی سو روپے دے جاتا ہے اور کوئی زیادہ ہی غریب ہو تو ہم پچاس روپے بھی لے لیتے ہیں .... اب آپ بولیئے کیا دیں گے؟"

"سو اور پچاس" کا سُن کر اللہ دتے کا سر چکرا گیا اسے ہر طرف اندھیرا سا محسوس ہونے لگا۔ کافی دیر تک رقم گھٹتی بڑھتی رہی اور آخر کار پانچ روپے میں سودا طے پا گیا۔

اللہ دتے نے سوچا کہ چلو اسمٰعیل کو کوٹ اگلے مہینے سے اگلے مہینے لے دوں گا۔ اس ماہ اسے اسکول میں داخل کروا دیتا ہوں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے انجمن کی طرف سے شکریہ کے ساتھ اللہ دتے کو ڈھائی روپے وصول پانے کی رسید کاٹ دی۔ اڑھائی ماسٹر رحمت الٰہی کو ملی اور دو روپے خود ان کے حصے میں آئے اور اللہ دتے کے خون پسینے کی کمائی میں سے مبلغ ڈھائی روپے "انجمن خدمتِ عوام" کے کھاتے میں چلے گئے۔ تب اسماعیل کا نام پہلی جماعت کے رجسٹر میں درج کر لیا گیا۔

شام کو اسمٰعیل اپنا سبق یاد کر رہا تھا .... الف .... بے .... پے .... تے ... اور اس کا باپ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یکایک اسمٰعیل قاعدے پر سے دھیان ہٹا کر بولا ——— "ابا جی! ماسٹر صاحب دو روپے فیس مانگتے تھے۔ ایک روپیہ اس مہینے کا اور ایک روپیہ پچھلے مہینے کا!"

یہ بات سُن کر اللہ دتہ بہت جھنجھلایا اور بولا ...

... "اچھا صبح مَیں تمہارے ساتھ اسکول چلوں گا!"

اللہ دتہ صبح جاتے ہی ماسٹر صاحب کے ساتھ الجھ پڑا کہ حکومت نے تعلیم تو مفت کر دی ہے تو پھر آپ فیس کس بات کی مانگتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور دو تین ماسٹر صاحبان نے اللہ دتے کی تسلی کر دی کہ ہم فیس نہیں لیتے بلکہ یہ تو اسکول کے لیے امدادی چندہ ہے جو ہر ماہ ہر طالب علم کو دینا پڑتا ہے جو نہ دے اس کا نام کاٹ دیا جاتا ہے۔

اللہ دتے کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ "امدادی چندے" اور فیس میں کیا فرق ہوتا ہے۔ تاہم اس ڈر سے کہ کہیں اسمٰعیل کا نام نہ کاٹ دیا جائے۔ اس نے چار و ناچار دو روپے ادا کر دیئے اور آئندہ ہر ماہ ایک روپیہ دینا منظور کر لیا۔ ابھی آٹھ دن بھی نہ گزرے تھے کہ اسمٰعیل نے کہا ...

... "ابا جی! ماسٹر صاحب کہتے تھے تین روپے لے کر آنا تمہیں کہانیوں کی کتابیں دینی ہیں!"

اللہ دتے کو اسمٰعیل کی بات سُن کر ماسٹروں پر بہت غصہ آیا۔ دوسرے دن وہ صبح سویرے اسمٰعیل کے ساتھ پھر سکول گیا اور ماسٹر صاحبان سے بہت بحث کی کہ ابھی بچے کو ابتدائی حروف کی تو شناخت نہیں وہ کہانیوں کی کتابیں کیسے پڑھ لے گا۔ اس قسم کی باغیانہ باتیں سُن کر تمام اساتذہ کرام اللہ دتے کے خلاف ہو گئے اور اسے تنبیہہ کی گئی کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔ ورنہ اس کے بچے کو سکول سے نکال دیا جائے گا۔

اللہ دتے نے مجبوراً تین روپے ادا کر دیئے اور چلا آیا۔

چند دن بعد اسمٰعیل سکول گیا ہی تھا کہ واپس لوٹ آیا۔ اس کے ابا نے پوچھا ——— "کیوں بیٹے! واپس کیوں آ گئے ہو؟"

"ابا جی! سکول میں پانچ روپے مانگتے ہیں!"

اب تو اللہ دتے کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی اس نے سکول جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

مودودی کو
اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا شوق ہے

شاھد

مودودی صاحب کا طرزِ رہائش خالص امریکی اور سرمایہ دارانہ ہے۔ کوٹھی میں ائرکنڈیشنڈ فٹ ہیں۔ بچے امریکہ میں پڑھ رہے ہیں۔ مودودی نے آجتک کبھی ٹانگے، رکشے یا ٹیکسی سے سفر نہیں کیا۔ علاج کے لئے دوبار لندن کا سفر کر چکے ہیں۔ جو شخص کئی مہینے لندن کے ہسپتال میں گزار سکتا ہے۔ وہ سادہ زندگی کا دعوٰی کیسے کر سکتا ہے۔ مودودی صاحب لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے سادہ زندگی بسر کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔

لوگ جائیں اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ انکے گھر میں ملازمین کی فوج ظفر موج کی تعداد کتنی ہے۔ کتنے کمرے ائرکنڈیشنڈ ہیں۔ کپڑے دھونے کی مشینیں کتنی ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر کہاں کہاں اور کتنی تعداد میں ہیں۔ ٹیلی ویژن سیٹ زنانے میں الگ، مردانے میں الگ ہیں۔ خانساماؤں کی تعداد کتنی ہے، ان کی کوٹھی کے عقب میں جو لان ہے، اس کی دیکھ بھال پر کتنا ماہانہ خرچ آتا ہے۔

مودودی صاحب کا ذریعۂ آمدنی بظاہر صرف کتابیں ہیں۔ وہ بھی لوگوں میں زیادہ تر مفت بانٹ دی جاتی ہیں۔ پھر گھر کے اتنے سارے اخراجات کس طرح پورے کئے جاتے ہیں۔

ایک ذریعہ آمدنی ان کا اور ہے۔ باہر کے ملکوں میں انھوں نے مختلف اداروں کو اپنی کتابوں کی اشاعت کے حقوق دیتے ہیں۔ یہ رائلٹی انھیں غیر ملکی زرمبادلہ کی صورت میں ملتی ہے۔ بلکہ بعض کتابوں کی رائلٹی تو انھیں یک مشت بھی مل جاتی ہے۔ یہ غیر ملکی اشاعتی ادارے بیشتر وہ ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سی آئی اے کے لئے کام کر رہے ہیں۔

جماعت اسلامی زکواۃ کی رقوم جمع کرتی ہے۔ لیکن ان کا استعمال پروپیگنڈے پر کرتی ہے۔ مولانا کوثر نیازی نے جماعت کو چیلنج کیا۔ زبانی بھی بات کی خط کے ذریعے بھی توجہ دلائی کہ تم جو زکواۃ جمع کرتے ہو اس کا اسی یا نوے فی صد کارکنوں کی تنخواہوں دفتر کے کرایوں اور جماعت کے پروپیگنڈے پر خرچ کرتے ہو۔ میں تو اس حقیقت کا برملا اظہار کر کے خدا کے سامنے بری الذمہ ہو گیا کہ زکواۃ کا یہ مصرف ہرگز ہرگز نہیں ہو رہا ہے۔ اب جماعت کو زکواۃ دینے والے سوچیں کہ کل خدا کے سامنے کیسے جواب دہ ہوں گے۔

جماعت میں ایک شعبہ "تالیفِ قلوب" ہے۔ اس کا تاریخی پس نظر یہ ہے کہ بعض غیر مسلموں کی بھرتی کے لئے زکواۃ کی مد سے انھیں کچھ رقم دی جاتی تھی۔ اگر انھیں صرف مالی مشکلات درپیش ہوتیں تو وہ ان سے نجات پا کر اسلام قبول کرنے کی طرف مائل ہوتے۔ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ بنے تو اس کو ختم کر دیا۔ اس لئے کہ اسلام ماشاءاللہ عروج پر تھا اب اس کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

مودودی صاحب نے زکواۃ کی یہ مد ان صحافیوں اور اہلِ قلم کے لئے کھلی رکھی ہے جو ان کے آلۂ کار بن سکیں۔ بعض لوگوں کو ماہوار تنخواہیں بھی دی جاتی ہیں۔ بعض کی بیاہ شادی یا دوسری ضرورتوں پر فوری امداد دی جاتی ہے۔ اس طرح ایسے لوگوں کے ذریعے اخبارات میں جماعت کے مخالفین کی خبروں کا بائیکاٹ کر دیا جاتا ہے۔ جماعتی زاویۂ نظر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس مقصد کیلئے ہر شہر میں جماعت کے پبلسٹی شعبے قائم ہیں۔

مودودی صاحب کو ہر ہفتے ان کی رپورٹ ملتی رہتی ہے۔ کہ خبروں اور بیانوں کے سلسلے میں کیا رفتار کار رہی ہے۔ جو صحافی ان کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں، انھیں آخر میں "امیر المومنین" سے ملنے کا شرف بخشا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی کی ساری خبریں مرکزی سیکرٹریٹ سے جاری ہوتی ہیں۔ جماعت کو صحیح معنوں میں کاغذی شیر کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ جماعت کا سارا دارومدار کاغذی کام پر ہے۔ حقیقت میں اس کا کہیں کوئی اثر نہیں ہے۔ مودودی صاحب کو اپنی پبلسٹی کی جتنی بھوک ہے شاید کسی دنیادار سیاستدان کو بھی نہ ہو۔

ایک طرف مودودی صاحب کا یہ دعوٰی کہ فوٹو حرام ہے۔ (ہمارا نظریہ اس سے مختلف ہے) دوسری طرف ان کے پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کی جانب سے فوٹوگرافروں کو خصوصی دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں کہ یہ میٹنگ مودودی صاحب کے کمرہ خاص میں ہوگی۔ اس کے لئے ان کے مخصوص پوز بنائے جائیں۔ مولانا خود بڑے اہتمام سے مختلف پوز بنواتے ہیں۔ اس پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ کے تمام کارکن باقاعدہ تنخواہ دار ہیں۔

جماعت کے ادیب نعیم صدیقی ۱۰۵۰/- روپے ماہوار پر پبلسٹی سیکرٹری کا کام کرتے ہیں۔ مگر اب خود انھیں امریکی من و سلوٰی براہِ راست ملنے لگا ہے۔ انھوں نے اپنا ادارہ دارالفکر قائم کر دیا ہے، جو چین اور تمام عوامی تحریکوں کی مخالفت میں امریکہ اور روس کی فراہم کردہ معلومات کتابی شکل میں شائع کرتا ہے۔ نوابزادہ شیر علی خان کی تقریریں بھی اس ادارے نے کتابی شکل میں چھاپی تھیں۔ نعیم صدیقی کے ساتھ اب اور کئی دوسرے آدمی بھی آ ملے ہیں۔ ان کا کام جہاں اخباروں کو بیانات بھیجنا ہے، وہاں یہ بھی ہے کہ کچھ اخبار نویسوں کی مذمت بھی کی جائے۔

مودودی صاحب میں اب لکھنے کی سکت نہیں رہی۔ قوتِ کار ختم ہو چکی ہے۔ اب سارا کام دوسرے کرتے ہیں۔ ہاں ایک زمانہ تھا کہ وہ اس قدر کام کرتے تھے کہ ان کی خدمت میں تعریف اور توصیف کے جو سپاسنامے پیش کئے جاتے وہ بھی خود لکھ کر دیتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں جب جماعت اسلامی لاہور میں خلافِ قانون قرار دی گئی تو اس کے بیت المال میں ۱۰۳۰۰۰ روپے تھے جو بحق سرکار ضبط کر لئے گئے۔

مودودی صاحب رہا ہو کر آئے تو مجھے (مولانا کوثر نیازی) کو کہا کہ تم اہالیانِ شہر سے ۱۰۲۰۰۰ روپے کی تھیلی دلا دو۔ میں نے کچھ آدمیوں کو تیار کیا۔ تھیلی بنوائی۔ سپاسنامہ بھی پیش کیا۔ وہ سپاسنامہ موصوف نے بقلم خود لکھا تھا اس میں انھوں نے اپنے قلم سے اپنے آپ کو مفکر اسلام، تحریکِ اسلامی کا داعی اور نہ جانے کیا کچھ لکھا تھا۔

تلاش ہوئی کہ اسے پڑھنے کے لئے کسی شخص کو کہا

جائے۔ بڑی مشکل سے مکتبہ کارروان والے چوہدری عبدالحمید ہاتھ لگے، انھوں نے مودودی صاحب کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا سپاسنامہ پڑھ کر سنایا۔ جو سپاس نامہ نہ تھا، مودودی صاحب کا قصیدہ تھا۔

مودودی کی تصانیف کا فراڈ

آج کل مودودی صاحب لکھنے لکھانے کا سارا کام ایک شخص کرتا ہے۔ جتنے بھی سوالات آتے ہیں، مودودی صاحب ان میں سے کسی کا بھی جواب نہیں دیتے۔ ایک نیک آدمی ان کا جواب لکھتا ہے۔ مودودی صاحب صرف اس پر دستخط کر دیتے ہیں۔ اس شخص کا نام ملک غلام علی ہے۔ مودودی صاحب کی تصانیف کے لئے برسوں سے یہی شخص ترتیب و تالیف کا کام انجام دے رہا ہے۔ مودودی صاحب اس سے کہہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں موضوع پر مواد چھانٹ لو۔ بیچارہ غلام علی مختلف کتابوں سے یہ مواد نکالتا ہے۔ اور نشان لگا کر کتابیں مودودی صاحب کی میز پر رکھ دیتا ہے۔ وہ ان پر سرسری نظر ڈال کر کہہ دیتے ہیں کہ اب ان نشان زدہ حصوں کو مربوط کر کے کتابی شکل دے دو۔ وہ کتابی شکل دیدیتا ہے۔

ملک غلام علی کا اندازِ تحریر بالکل مودودی صاحب جیسا ہے، کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اب ملک غلام علی بالکل "فنافی المودودی" ہو گیا ہے۔ اس کا نام کہیں نہیں چھپتا۔ لوگوں کو معلوم نہیں کہ ملک غلام علی کون ہے۔ لوگ صرف مودودی صاحب کو جانتے ہیں، جن کے نام سے یہ کتابیں چھپتی ہیں، پڑھنے والوں کو یہ کیا علم ہو کہ یہ کتابیں کس کی تصنیف ہیں۔ ملک غلام علی کی زندگی کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔

اسی طرح مودودی صاحب کی کتابوں کے عربی ترجموں کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ دنیا مودودی صاحب کو عربی کا فاضل اجل سمجھتی ہے۔ پاکستان کے باہر بھی لوگ ان کے بارے میں ایسے ہی مغالطے میں مبتلا ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتابوں کو عربی میں عاصم الحداد نے منتقل کیا۔ اس غریب کا کہیں نام تک نہ آیا۔ سارا کریڈٹ مودودی صاحب نے لے لیا۔ ان تصانیف پر مودودی صاحب نے اپنا نام اس طرح چھپوایا جیسے عربی ایڈیشن بھی ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔

بقیہ: عثمان بلوچ

کمیٹیاں بنائی جائیں جو ہر مل اور کارخانے میں جا کر پیداوار کی صورتِ حال کا جائزہ لیں۔ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ جو پیداوار ہو رہی ہے کیا وہ سب ریکارڈ پر لائی جاتی ہے یا پہلے ہی کی طرح بلکہ اس سے بڑے پیمانے پر مال غائب کر کے ایکسائز ڈیوٹی بچانے کے ساتھ ساتھ قیمتوں میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ حکومت کو اطلاعات فراہم کرنے والے خفیہ ادارے اب تک وزیرِ اعلیٰ کو —— یہ اطلاع کیوں نہیں دے پائے کہ آج بھی ہول سیل مارکیٹ میں بغیر رسید کے مال بیچا اور خریدا جا رہا ہے اور اس مال کے دام رسید پر بکنے والے مال سے کم ہیں۔

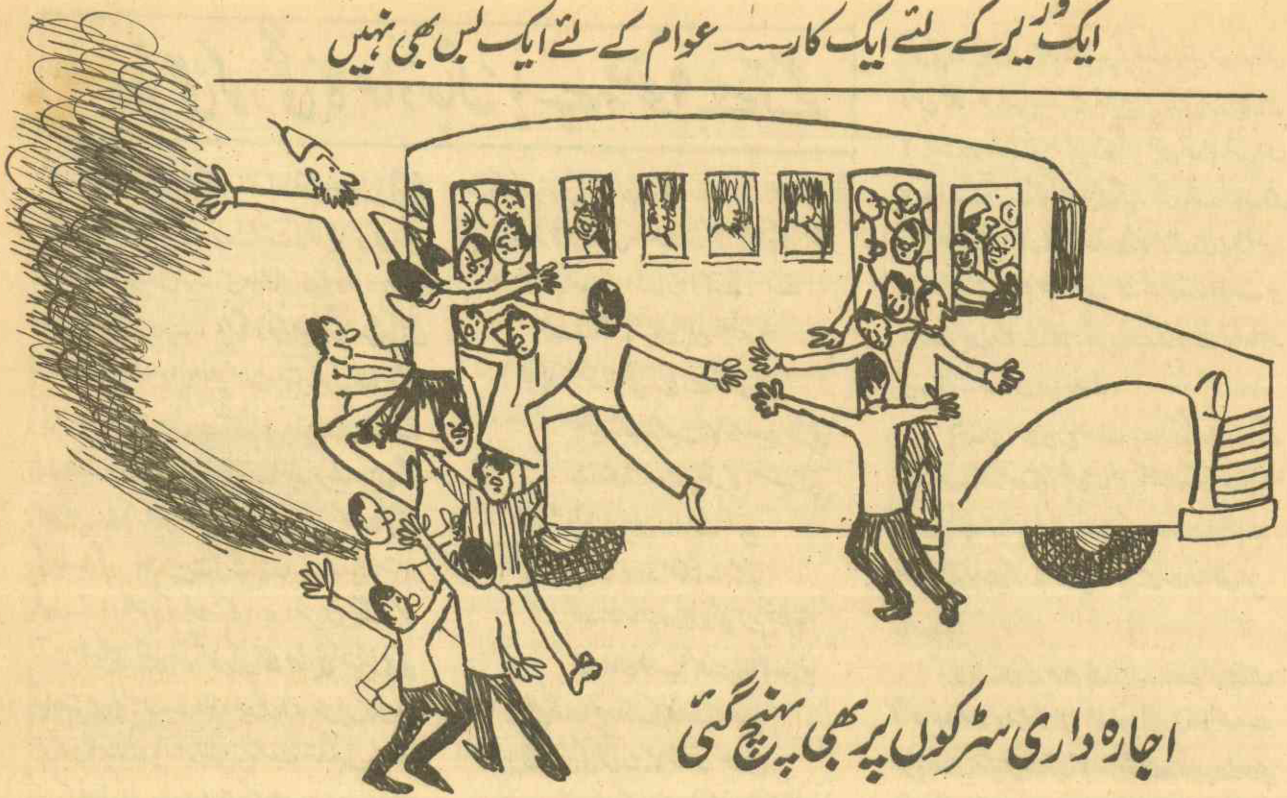
دوسری بات یہ کہ جہاں فی الحقیقت پیداوار میں کمی ہوئی ہے وہاں پیداوار کی وجوہات تلاش کر کے یہ دیکھا جائے کہ اصل مجرم کون ہے؟ اور کون حکومت پر معاشی دباؤ ڈال کر اپنی بات منوانے اور اپنی پسند کی پالیسیاں بنوانے کے لیے یہ بحران پیدا کر رہا ہے۔

وزیرِ اعلیٰ صاحب نے پورے بیان میں صرف مزدوروں اور حکومت کا ذکر کیا ہے اور تیسرا فریق سرمایہ دار وزیرِ اعلیٰ صاحب کی نظر میں فرشتے ہیں یا حرف بہ حرف حکومت کی ہدایات پر عمل کر رہے ہیں

آخری بات جو وزیرِ اعلیٰ صاحب نے فرمائی ہے وہ ملک میں مزدوروں کی تعداد اور ان کے مطالبات کے بارے میں ہے اور انداز ایسا اختیار کیا ہے کہ مزدوروں کو عوام کے دوسرے گروہوں سے علیحدہ کیا جا سکے۔ ہم وزیرِ اعلیٰ صاحب کو بتا دینا چاہتے ہیں کہ ان کوششوں سے نہ تو پہلے کوئی فائدہ پہنچا ہے اور نہ اب پہنچ سکتا ہے۔ مزدوروں نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ حکومت ترقیاتی اخراجات کی رقم مزدوروں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے یا ان کے لیے خصوصی امداد مہیا کرے۔ ان کا مطالبہ صرف یہ رہا ہے کہ ان کے اپنے پیداواری عمل کی بنیاد پر سرمایہ دار جو منافع کما رہے ہیں اس میں سے انہیں سہولتیں مہیا کی جائیں۔

آخر میں ہم وزیرِ اعلیٰ صاحب پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ انتظامی احکامات جاری کرنے اور طاقت کے ذریعے ان کی تعمیل کروانے کی کوشش سے نہ صنعتی امن دیرپا بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس طریقے سے عوام کو دوست بنایا جا سکتا ہے۔ لوگ اب بھی سادہ ہیں لیکن بیوقوف نہیں کہ صحیح صورتِ حال نہ سمجھ سکیں۔

ایک وزیر کے لئے ایک کار ــــ عوام کے لئے ایک بس بھی نہیں



اجارہ داری سڑکوں پر بھی پہنچ گئی

جاوید احمد

لانڈھی، ملیر، ڈرگ روڈ اور ملیر کے لوگوں کے لئے آمد و رفت کا مسئلہ فوجوں کی واپسی کے مسئلہ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اس مسئلہ کو کئی مرتبہ حل کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اور ہر دفعہ نظر انداز کر دی گئی۔ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر پڑھی کہ "عنقریب کراچی میں اومنی بسوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کیا جائے گا۔" یہ خبر پڑھ کر لوگوں نے ضرور ٹھنڈی سانس لی ہوگی، اور شاید ــــ دیگیں بھی اتروائی ہوں گی۔

ہے بھی ٹھیک! کیوں خوشی نہ ہو ان بیچاروں کو در اصل یہ لوگ روزآنہ بسوں میں اتنی کڑی ورزش کرتے ہیں کہ جسم کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگتا ہے۔ اور کام کرنے کی تمام تر طاقت اس ورزش کی نذر ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ تو رات کو محض اس خیال سے نہیں سو سکتے کہ صبح شہر جانے کیلئے اُسے بس میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونسا جائے گا، بال کھینچے جائیں گے، کپڑے پھاڑے جائیں گے، جسم کو اس قدر دبایا جائے گا کہ بے ساختہ چیخ نکل جائے گی، کہنیاں ماری جائیں گی، یعنی اسے قیامت کی آزمائشوں سے گزرنا ہوگا۔

منی ٹیکسیوں نے اس مسئلہ کو معمولی طور پر حل کیا ہے۔ لیکن بیچارے لوگ مہینے کی شروع شروع کی تاریخوں میں، جب تک ان کی جیب میں چند روپے رہتے ہیں، سفر کرتے ہیں، بعد میں دھواں اگلتی، کھڑکھڑاتی، ٹھسا ٹھس بھری ہوئی بسوں پر ہی تکیہ کرتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو کراچی شہر میں ۹۰ فیصد لڑائی جھگڑے اور حتیٰ کہ قتل کی حد تک سنگین وارداتیں بسوں ہی میں جنم لیتی ہیں۔ یار لوگ رش کی وجہ سے اتنے جھنجھلائے ہوتے ہیں کہ اپنی منزل مقصود پر پہنچنے تک، ڈرائیور، کنڈیکٹر اور حکومت کی شان میں فی البدیہہ قصیدے پڑھتے ہیں۔ اگر کسی کا پاؤں غلطی سے دب گیا تو بس ــــ ہو گیا پھڈا۔

متوسط طبقے کے سفید پوش لوگ ــــ واللہ ان بیچاروں کی جو درگت بنتی ہے وہ خاصی عبرت انگیز ہوتی ہے۔ نزاکت اور شرافت ہیں۔ دُہرے ہو جاتے ہیں مگر بھیڑ کے ڈر سے اُف تک نہیں کرتے۔ زیادہ تکلیف ہوتی ہے تو منمنا کر رہ جاتے ہیں:" بھائی کنڈیکٹر ہم آدمی ہیں بھیڑ بکری نہیں، اگر لمبے تڑنگے کنڈیکٹر نے گھور کر دیکھا تو الفاظ منہ میں چبا کر رشتک جاتے ہیں۔

بعض اوقات تو ــ عورتوں کی پرواہ کئے بغیر لوگ لیڈیز کمپارٹمنٹ پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ اور بعض خنڈہ صفت لوگ موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن کے اہل و عیال ہوتے ہیں وہ چیختے ہیں۔ اور بے تحاشا چیختے ہیں، "کنڈیکٹر" "کنڈیکٹر" کی چیخوں سے ساری بس سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اور کنڈیکٹر میاں ــــ کچھ ایسے غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ــــ آخر ان کی کمیشن کا مسئلہ ہوتا ہے۔

جو بسیں اس وقت کراچی میں چل رہی ہیں ان کی کہانی بھی عجیب ہے۔ سردیوں میں ان میں ایک شیشہ دکھائی نہیں دیتا جو ٹھنڈی ہوا کو روک سکے۔ اور گرمیوں میں تمام شیشے لگے ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اتنی گھٹن ہوتی ہے کہ ــــ دم کا بھروسہ نہیں ہوتا۔ بعض بسیں تو ایسی ہیں کہ ان کے متعلق کہا ہی نہیں جا سکتا کہ کسی وقت پنکچر ہو جائیں۔ یا اڑی کر جائیں اور جب یہ شیر کی بچی چلتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی وقت بھی اسٹیرنگ ڈرائیور کے ہاتھ میں آ جائے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے سائیلنسر بس کے نیچے نہیں بلکہ سیٹوں کے نیچے لگا ہو۔ پٹرول کا دھواں مسافروں کو اندھا کئے دیتا ہے۔ لیکن مجبوراً ان بسوں میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ ان میں بچے، جوان، بوڑھے عورتیں عمر رسیدہ لوگ ہوتے ہیں اور سب کے ساتھ مساوی سلوک ہوتا ہے۔ بالکل درست عوامی حکومت ہے ــــ مساوات اس کا نصب العین ہے۔ جو عوامی حکومت چاہتی وہی کچھ بسوں میں ہو رہا ہے ــــ لیکن کسی بھی حاکم کو بس میں چڑھتے نہیں دیکھا گیا ــــ شاید پیدل چلتے ہوں ــــ کراچی میں ــــ یہ ناممکن ہے تو پھر ــــ پچھلے، دنوں اخبار میں یہ بھی پڑھنے میں آیا کہ حکومت وزرا کے لئے کافی کاریں بیرونی ممالک سے منگا رہی ہے ــــ اور پھر کہ وزیر کو ایک کار دی جائے گی ــــ عجیب بات ہے ایک

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ فرمائیں

لانڈھی کورنگی کا محاذ جاگ رہا ہے۔ صفحہ ۹ سے آگے

ہیں۔ وہ وزیر ہونے کے ساتھ ساتھ پیپلز پارٹی کراچی زون کے بھی صدر ہیں۔ وزارتِ محنت کی لاپرواہی اور مزدور رہنماؤں کے وارنٹ گرفتاری جاری کرنے کی وجہ سے حالات دن بدن بگڑتے رہے۔ ۱۷ر اکتوبر کو لیبر آرگنائزنگ کمیٹی کے ایک وفد نے صوبائی وزیرِ محنت ستار گبول سے ملاقات کی، انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وزیرِ موصوف نے وعدہ کیا کہ مزدوروں کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے اور یقین دلایا کہ حکومت کی جانب سے کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی۔ بات چیت آگے بڑھانے کے لیے ستار گبول نے ۱۸ر اکتوبر کو بارہ بجے اپنے دفتر میں میٹنگ کا وقت مقرر کیا۔ لیکن ۱۸ر اکتوبر کی صبح کو ڈپٹی کمشنر کراچی کی قیادت میں پولیس نے داؤد اور گل احمد ملز میں کارروائی کر کے یہ ثابت کر دیا کہ صوبائی وزیرِ محنت ستار گبول نے ۱۷ر اکتوبر کو غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ کیونکہ وزیرِ محنت کی اجازت اور اس کے علم میں لائے بغیر مزدوروں کے خلاف پولیس کارروائی ناممکن بات ہے۔

یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں جب کسی کو ملاقات اور مذاکرات کے لیے بلایا جاتا ہے تو اصولی اور اخلاقی طور پر یہ بات طے ہوتی ہے کہ اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ تو ستار گبول کی دَورِ وزارت ہی کا کارنامہ ہے کہ جب ۷ر جون کی مزدور تحریک کے دوران مزدور رہنماؤں سے مذاکرات کا سلسلہ جاری تھا تو ایک مرتبہ مذاکرات کے فوراً بعد متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر عثمان بلوچ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی ——— اور یہ واقعہ تو ابھی حال ہی میں ہوا ہے کہ متحدہ مزدور فیڈریشن کے چند رہنما جن میں زین زیب ملز کے صدر باور خان، جنرل سیکرٹری بخت رواں، جناب حبیب الرحمٰن ہزاروی، متحدہ مزدور فیڈریشن کراچی کے آرگنائزنگ سیکرٹری کرامت علی بھی شامل تھے، ستار گبول کی مقرر کردہ میٹنگ میں شرکت کے لیے گئے، میٹنگ کے فوراً بعد انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اسی لیے مزدوروں کا مطالبہ ہے کہ ستار گبول کو وزیرِ محنت کی بجائے پولیس کا سربراہ بنایا جائے۔ کیونکہ ان کے دورِ وزارت میں جتنے مزدوروں کو شہید کیا گیا اتنے تو پورے ایوبی دَور میں بھی نہیں ہوئے تھے۔

اخبارات میں داؤد کاٹن ملز، گل احمد ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں پر پولیس کی وحشیانہ فائرنگ اور شہید ہونے والوں کو حکومت کی جانب سے معاوضہ کے اعلان کی خبر ایک ساتھ شائع ہوئی۔ معاوضہ کے اعلان کی خبر پڑھتے ہی بے اختیار یہ اشعار یاد آئے۔

مژدہ اے خاک نشینانِ چمن مژدہ باد
بھوک دستور نہ تھی آج سے دستور بنی
بھیک تجدیدِ محبت کا وسیلہ ٹھہری
بے زری زیست کی تعمیر کا منشور بنی
مژدہ اے نغمہ سرایانِ روایاتِ کہن
آج پیمانِ وفا جو دو سخا تک پہنچا
اِک نئے حاتمِ دوراں کی کرم بخشی سے
آج دامانِ طلب، بخت ہما تک پہنچا
کل بھی اک حاتمِ دوراں کی سخاوت کا بھرم
اپنی تاریخ کی ثروت کا بنا تھا عنوان
آج بھی اِک نئے حاتم کی نوازش کے طفیل
زندگی دیکھتی ہے عظمتِ فردا کا نشاں
(احمد ریاض)

یہ بیسویں صدی ہے۔ ایک مہذّب اور ایٹمی دَور کا زمانہ، جس میں عادل، انصاف اور جمہوریت کے خوش کن نعرے لگائے جاتے ہیں۔ حقوقِ انسانی کے چارٹر بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ آنکھوں سے لگائے جاتے اور سروں پر رکھے جاتے ہیں لیکن ——— یہ کیا طرفہ تماشہ ہے کہ اِس مہذب دَور میں، ایٹمی عہد میں پاکستان میں انسانی جانوں کی قیمت مقرر کی جا رہی ہے، انسانی جانیں خریدی جا رہی ہیں، بولیاں لگ رہی ہیں ——— یہ انسانوں کے خریدار کہاں سے آگئے؟ سرمایہ داروں کے تحفظ کے لیے مزدوروں

گجرات کے محمّد صابر کے خون سے کراچی کی زمین سُرخ ہو گئی

کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے اور پھر معاوضہ ادا کیا جاتا ہے۔ یہ معاوضہ بھی سرکاری خزانے سے دیا جاتا ہے اور یہ وہ روپیہ ہوتا ہے جو عوام ٹیکس کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔

سندھ حکومت تین مرتبہ انسانی جانیں خرید چکی ہے ۷ر اور ۸ر جون کے شہیدوں کا معاوضہ ادا کیا، لسانی فسادات میں ہلاک ہونے والوں کا معاوضہ دیا گیا۔ اور اب داؤد اور گل احمد ملز کے شہیدوں کے ورثا کو دیا گیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۷ر اور ۸ر جون اور حالیہ مزدور تحریک کے دوران حکومتی ذرائع ابلاغ عامہ نے پراپیگنڈہ کیا کہ مزدور وطن دشمن تھے، تخریب پسند تھے بلکہ ان پر روس اور بھارت کا ایجنٹ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا لیکن بعد میں شہیدوں کا معاوضہ ادا کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اگر یہ شہید مزدور وطن دشمن اور تخریب پسند تھے تو معاوضے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ "مجرم" نہیں تھے تو ان کے خلاف یہ الزامات کیوں لگائے گئے۔ اگر وہ بے گناہ تھے تو معاوضہ کیسا؟ ... قصاص دیا جائے۔

پاکستان اسلامی ریاست ہے۔ آئین سازی کے حالیہ سمجھوتے اور عبوری آئین میں بھی پاکستان کو "اسلامی جمہوریہ" قرار دیا گیا ہے اور اسلام میں قصاص کو پہلا درجہ دیا گیا ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ اسلامی قوانین کے مطابق قصاص ادا کرے۔

آج پاکستان کے عوام بڑے کرب سے یہ سوچتے ہیں کہ "عوام طاقت کا سرچشمہ ہیں" کا نعرہ لگانے والی حکومت سرمایہ داروں کو کیوں طاقت کا سرچشمہ سمجھنے لگی ہے اسلامی سوشلزم کی داعی حکومت اور قانون کی محافظ پولیس کے لیے عوام کا نام سیٹھ داؤد، ولیکا، آدم جی، سہگل اور گل احمد کیوں ہے؟ انسان صرف سرمایہ دار اور وڈیرہ کیوں ہے؟ یہ سوالات جو عوام کے ذہنوں میں سوالیہ نشان بن کر رہ گئے ہیں، ان کا جواب یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ داروں اور وڈیروں کو ہی "عوام" سمجھا جاتا ہے ان کے مفادات "ملکی، قومی اور عوامی مفادات" ہوتے ہیں۔ اور جو ان کے مفادات پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ عوام دشمن، ملک دشمن اور تخریب پسند گردانا جاتا ہے۔ مزدور، کسان، طلباء اور محنت کش عوام اس نظام میں رینگتے ہوئے کیڑوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اس استحصالی نظام کے رکھوالے اور سامراج کے گماشتہ ہر بار نئے لبادوں میں سج کر سامنے آتے ہیں۔ پرانی تیغیں نئی نیاموں میں ڈھل جاتی ہیں۔ سامراجی اور سرمایہ دارانہ مفادات کے تحفظ کے لیے کبھی آمریت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کبھی صدارتی نظامِ حکومت اور کبھی پارلیمانی جمہوریت کا! چنانچہ مزدوروں اور کسانوں کے سچے ہمدرد دوست اور عظیم انقلابی رہنما حسن ناصر شہید لکھتے ہیں:-

"سامراج اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مختلف طریقے اپناتا ہے۔ یہ پارلیمانی جمہوریت کے ذریعے بھی کام

اب سرمایہ دار طاقت کا سرچشمہ ہیں

کر سکتا ہے۔ اور آمریت کی انتہائی برہنہ شکل کے فیصلے بھی، اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ کسی مخصوص وقت میں کون ساطرزِ حکومت اس کے مفادات پر پورا اترتا ہے، اور کس سے اسے بہترین نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ سامراج ان دو میں سے کسی ایک طرزِ حکومت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ترقی دیتا ہے۔ جہاں کہیں بھی اس کے مفادات تقاضا کریں، خواہ کتنے ہی وقتی طور پر کیوں نہ ہوں، تو وہاں سامراج جمہوریت کے معمولی آثار تک تباہ کرنے میں رتی برابر تکلف سے کام نہیں لیتا۔ اور اس سلسلہ عمل میں اپنے قریب ترین حمایتیوں کو دغا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔"

یہ ۱۹۵۹ء کی تحریر ہے۔ لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے۔ وہ جب بھی صحیح تھی۔ آج بھی صحیح ہے۔ عوام نے اپنی پسند کی پارٹی کو انتخابات میں کامیاب کرایا اور مسندِ اقتدار پر بٹھایا۔ اس کے باوجود نوکر شاہی اور پولیس کی ذہنیت تبدیل نہ ہوئی۔ استحصال اور ظلم و تشدد کی گرفت ڈھیلی ہونے کی بجائے اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ وطنِ عزیز پر گماشتہ سرمایہ داروں کی حاکمیت رہی۔ اور وہ منزل نہیں آئی جس کے محنت کش اور عوام تمنائی ہیں۔ وہ منزل ہے وہ معاشرہ جہاں انسان، انسان کا غلام نہ ہوگا۔ استحصال ہوگا نہ لوٹ کھسوٹ۔

عوام نے غبارِ رہ کو نشانِ منزل سمجھ کے فریب کھایا اسلامی سوشلزم کے نعرے پر اعتماد کیا۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد پیپلز پارٹی کا طبقاتی کردار کھل کر سامنے آگیا۔ زرِ مبادلہ کو "قوم کا خون" کہا گیا۔ بیرونِ ملک جمع زرِ مبادلہ واپس لانے کی تاریخ مقرر کی گئی۔ نہ لانے والوں کو پھانسی کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن اندرونِ خانہ فیڈریشن آف کامرس اینڈ انڈسٹری سے معاہدہ کیا گیا۔ فیڈریشن نے داؤد اور ولیکا کی رہائی کے بعد معاہدے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ تو تب بھی اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ سمجھوتہ عوام سے چھپایا گیا زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے مالک نے مزدوروں کو آٹھ ماہ تک تنخواہ ادا نہیں کی تب بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی، جب بہت زیادہ احتجاج کیا گیا تو نیم دلانہ اقدامات کئے گئے۔ مالک کو گرفتار کیا گیا لیکن مزدوروں کو تب بھی تنخواہ نہیں ملی۔

اب عالمی بنک، کنسورشیم اور دیگر بین الاقوامی اداروں سے قرضے لینے کی خاطر مزدوروں اور کسانوں کو ظلم و تشدد کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ ان اداروں نے قرضہ دینے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ مزدور اور کسان تحریک کو کچلا جائے۔ تاکہ انھیں ان کے سرمایہ کی ضمانت مل سکے۔

لانڈھی کورنگی کا حالیہ المیہ عوامی طاقتوں کو دعوتِ فکر دے رہا ہے۔ پوچھ رہا ہے کہ غبارِ رہ کو نشانِ منزل سمجھ کر کب تک فریب کھاتے رہو گے، ضرورت ہے کہ مزدور طبقے سے کوئی اٹھے، اور رہنمائی کرے، ہشت نگر، تخت بھائی، جھل جاؤ، اور کراچی کے عوامی تحریکوں اور عوام دوست طاقتوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دے۔ تخت بھائی اور جھل جاؤ میں گولی چلے تو کراچی کے محنت کش تڑپ اٹھیں، اور اگر کراچی کے مزدوروں پر ظلم ہو تو اس کا درد سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے کسان اور مزدور محسوس کریں۔ عوامی طاقتوں کے ملک گیر اتحاد سے ہی داؤدوں، ولیکاؤں، سہگلوں، ہارونوں نوکر شاہی، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو شکست دی جا سکتی ہے۔ اگر اب بھی عوامی طاقتیں متحد نہ ہوئیں تو یہ استحصالی نظام قائم رہے گا۔ ہڑتالیں ہوتی رہیں گی اور ناکام ہوتی رہیں گی۔ مزدور برطرف اور کسان بے دخل ہوتے رہیں گے۔ اور

تمہاری روحوں تمہارے جسموں کو ایک نانِ جویں کی خاطر
انھیں اندھیری ملوں میں اب بھی مشین کی طرح جینا ہوگا
تمہاری ماؤں تمہاری بہنوں کو اب بھی بے نور جھونپڑوں میں
اداس ممتا، بھری جوانی کا زہر ہنس ہنس کر پینا ہوگا
تمہارے نقاش اب بھی ذہنوں کی یاسیت کا شکار ہونگے
تمہارے فنکار اپنے گیتوں کے ساتھ بکتے رہیں گے اب بھی
تمہارے دہقان سبز کھیتوں کے پاس دم توڑتے رہیں گے
تمہارے مزدور راستوں پر یونہی سسکتے رہینگے اب بھی

بقیہ: سڑکوں پر اجارہ داری

وزیر کے لئے ایک کار اور ایک سو عوام کے لئے ایک بس بھی نہیں —— وزیر لوگ اور دوسرے بڑے بڑے افسر ملک و قوم کی ترقی کے لئے کیا کچھ کرتے ہیں! کچھ بھی نہیں! کون سا وزیر یا افسر ہل چلاتا ہے، مل کے گیٹ پر لائن میں کھڑا ہوتا ہے، ہتھوڑا چلاتا ہے! نہیں —— حکم چلاتا ہے —— ان کسانوں پر، مزدوروں پر —— یہ جو ملک و قوم کے ستون ہیں۔ جن کے بغیر پیداوار میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔ پیداوار میں اضافہ یہ کریں، لبوں سے گر گر یہ مریں، پانی کو یہ ترسیں، گرم بھٹیوں کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو یہ گلائیں، لیکن حاکم کاروں کے مزے لے —— آرام تو ان محنت کشوں کو چاہیئے جو اپنے آپ کو جلا کر ملوں کی چمنیوں کو زندہ رکھتے ہیں۔ جو سب کچھ کرتے ہیں —— ان کے لئے کچھ بھی نہیں۔



غازی مختار

مرچوں کی منڈی عذاب بن گئی

خیبر سے کیماڑی تک

دن کا پچھلا پہر ہے ایک عورت چولہے کے پاس بیٹھی آٹا گوندھ رہی ہے۔ آنکھیں بھیگی بھیگی اور سرخ ہیں۔ سال بھر کا ایک بچہ گود میں پڑا چلائے جا رہا ہے۔ عورت آٹا گوندھتے میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بچے کو تھپک کر خاموش کرانا چاہتی ہے۔ بچے کی آنکھیں سرخ ہیں رال اور سینڈھ نے پورے چہرے اور کرتے کا گریبان گیلا کر دیا ہے۔ آواز بھی قدرے بیٹھی بیٹھی ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کافی دیر سے مسلسل رو رہا ہے۔ بچہ اور ماں وقفہ وقفہ سے چھینک رہے ہیں۔ ماں نے غصہ میں آکر بچے کو ایک دو تھپڑ مارا اور گود سے نکال فرش پر پٹخ دیا۔ بچہ اور زور زور سے رونے اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور ایک تندرست و توانا نوجوان مکان میں داخل ہوا۔ روتے ہوئے بچے کی طرف تاسف بھری نظروں سے دیکھا اور عورت کو گھورنے لگا۔ عورت نے رونی آواز میں کہا، "کیا کروں۔ روتے ہی چلا جا رہا ہے۔ لاکھ چپ کراؤ مانتا ہی نہیں — خدا غارت کرے اس... چیئرمین کو کمبخت نے دوزخ میں جھونک دیا۔"

نوجوان نے رحم بھری نظروں سے بچے کو دیکھا اپنی ناک ہنسکی کندھے پر پڑے رومال سے چہرہ پونچھا اور اسی رومال سے بچے کا ناک منہ صاف کر کے گود میں اٹھا لیا۔

کلاس لگی ہوئی ہے کمرے میں بچے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں اور ایک منحنی سا ماسٹر میز کے پیچھے کھڑا پڑھا رہا ہے۔ لڑکے ڈیسکوں پر کھلی کتابوں پر جھکے ہوئے ہیں چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی ہیں۔ اور آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ کمرے میں موجود ہر آدمی تھوڑی دیر بعد چھینک اور کھانس رہا ہے۔ اور بار بار ناک رگڑ رہا ہے —— ماسٹر کو چھینک آئی اور وہ دوہرا ہو گیا —— سیدھا ہوتے ہوئے ناک پونچھا اور زور زور سے کتاب سے سبق پڑھانے لگا۔

ایک مکان کا کمرہ ہے —— ایک عورت پلنگ پر چادر اوڑھے لیٹی ہے۔ پہلو میں چھوٹا سا دو چار دن کا معصوم بچہ پڑا بلک رہا ہے۔ ماں بچے کو مسلسل تھپک رہی ہے مگر بچہ اپنی باریک آواز میں چلائے جا رہا ہے۔ ایک بوڑھی —— بڑبڑاتی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ پلنگ پر لیٹی عورت اسے بے بس نظروں سے دیکھتی ہے۔ بڑی بی کے ہاتھ میں گھی کا ڈبہ ہے۔ بڑی بی نے بچے کو اٹھایا۔ کرتہ کھولا۔ بائیں ہاتھ پر اٹھایا اور دائیں ہاتھ سے ڈبے کا ڈھکن کھول بچے کو گھی چپڑنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی بڑی بی مسلسل بڑبڑاتے جا رہی ہیں۔

ایک بڑی بی لاٹھی پکڑے سڑک پر چلی جا رہی ہیں زور سے چھینک آئی اور بڑی بی کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی چھینک نے بڑی بی کو دوہرا کر دیا۔ توازن برقرار نہ رہا اور بڑی بی کا سر زور سے قریب کھڑی جیپ کے ساتھ ٹکرایا۔ بڑی بی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ دو چار آدمی جلدی سے بڑی بی کی طرف لپکے۔ بڑی بی کو اٹھانا چاہا تو وہ پھٹ پڑیں۔ کوسنوں کی لائین لگا دی۔ بڑی بی دامن پھیلاتے چند نام لے لے کر بد دعائیں دے رہی ہیں اور بچوں بڑوں کی تعداد بڑی بی کے گرد بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک زور کی چھینک آئی اور بڑی بی کا سر زمین کے ساتھ لگ گیا۔

قارئین کرام! جو کچھ ہم نے آپ کو بتایا ہے یہ حقیقت ہے۔ ہمارے شہر کنری کے عوام کی جان آجکل واقعی عذاب میں ہے۔ خصوصاً معصوم بے زبان بچوں اور عمر رسیدہ لوگوں کی حالت بہت خراب ہے۔ ہم بارہا آپ سے بتا چکے ہیں کہ کنری ایشیاء کی سب سے بڑی مرچ منڈی ہے۔ اور ہر سال لاکھوں من سرخ مرچ اس منڈی میں خریدی اور بیچی جاتی ہے۔

پہلے یہ مرچ منڈی شہر کے جنوب مشرق میں ایک کاٹن جننگ فیکٹری کے قریب تھی۔ مگر شہر کے مغرب میں ایک چوہدری کی کافی زمین بنجر غیر آباد پڑی تھی۔ اس زمین میں زیادہ ٹکڑے میں کلر اور سیم اس قدر زیادہ تھا کہ کوئی شریف آدمی اس میں سے گزر تک نہیں سکتا تھا۔ اور باقی میں پانی نہ لگنے کے سبب کوئی فصل نہیں بیجی جاتی تھی۔ اس زمین کا مصرف چوہدری صاحب کی موٹی عقل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی مشکل تھا۔ اور یہ زمین چوہدری کے لئے ایک مسئلہ تھی۔

سابق چیئرمین اور چوہدری صاحب کے درمیان کچھ عرصہ کے مذاکرات کے بعد ایک معاہدہ ہو گیا اور چوہدری صاحب نے کافی رقبہ منڈی بنانے کے لئے ٹاؤن کمیٹی کو مفت دینے کا اعلان کر دیا۔ جس کو چیئرمین نے معاہدہ کے تحت فوراً بالا حکام سے منظور کرا لیا۔ اور فوراً ہی ٹاؤن کمیٹی نے لاکھوں کی لاگت سے منڈی کی بنیادیں اٹھانی شروع کر دیں۔ اور اسطرح مفت منڈی کا ٹکڑا دے دینے سے اس زمین کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ اور پھر بیوپاریوں اور دوسرے ضرورت مندوں نے پلاٹ خرید خرید کر دکانیں اور مکانات بنانے شروع کر دیئے۔ اور جس زمین سے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا اس نے چوہدری صاحب کو لاکھوں روپیہ دیا۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ صوبہ سندھ میں اور خصوصاً ہمارے علاقہ میں تقریباً سارا سال ہی مغرب سے مشرق کو یا شمال مشرق کو ہوائیں چلتی ہیں۔ چوہدری صاحب کی رقم کھڑی ہو گئی۔ مگر مرچ منڈی کیا بنی شہر والوں کی زندگی دوبھر ہو گئی۔

پہلے سال جب منڈی چلی تو قریب ہی ڈی سی ہائی اسکول میں بچوں کی حالت اس قدر خراب ہوئی کہ لڑکوں نے اسکول کا بائیکاٹ کر دیا اور مطالبہ کیا کہ منڈی ہٹائی جائے یا مرچ منڈی کسی اور جگہ منتقل کی جائے۔ اس منڈی میں صرف دوسری اجناس کی خرید و فروخت ہو۔ چیئرمین، چوہدری اور ان کے دوسرے بہت سے ساتھیوں نے لڑکوں کی منت سماجت کی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ منڈی کے آگے شہر کی طرف ایک بڑی دیوار بنا دیں گے اور اس طرح مرچیں ان تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ اور پھر ہزاروں روپے کے خرچ سے ایک بیس فٹ بلند دیوار شہر کی طرف بنا دی گئی۔ تب تک سیزن ختم ہو گیا۔ منڈی کی زمین چوہدری صاحب سے مفت ملی تھی۔ مگر یہ فالتو دیوار جو بنوانی پڑی اس پر اتنی رقم خرچ ہو گئی کہ منڈی کے برابر زمین کہیں بھی قیمتاً خریدی جا سکتی تھی۔ عوام اور حکومت پر ظاہراً جو مفت منڈی کی جگہ دینے کا احسان ہے وہ اس دیوار نے پورا کر دیا۔

اب دیوار موجود ہے۔ مگر مرچوں کے ذرے پورے شہر میں اڑتے ہیں۔ اور سارا شہر کھانس کھانس اور چھینک چھینک کر ادھ موا ہو جاتا ہے۔ آج کل مرچوں کا سیزن ہے اور آج کل ہی ہواؤں کے تیز جھکڑ چلتے ہیں، جو مرچوں کے ذرات کو

میلوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ لوگوں کے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور کھانسی دچھینکیں کسی کو کسی قابل نہیں رہنے دیتیں۔ اور یہ چار ماہ لوگ چیئرمین اور چوہدری کو گالیاں اور بد دعائیں دیدے کر گزار تے ہیں اور سائیں ٹھنڈا پانی پی پی کر کوستی ہیں۔

لوگوں کو کامل یقین ہے کہ اگر چند سال یہاں منڈی اور رہ گئی تو کنری کی اکثر آبادی کے پھیپھڑے کھانسی کے سبب ماؤف ہو چکے ہوں گے۔ کئی لوگ بینائی سے محروم ہو جائیں گے اور جو باقی بچیں گے وہ کئی قسم کی جسمانی اور جلدی بیماریوں کی لپیٹ میں ہوں گے۔ ڈاکٹروں کے مطابق شہر میں مرچوں کی منڈی ہی کے سبب کئی قسم کی بیماریوں میں خطرناک اضافہ ہو رہا ہے۔

سوات مینگورہ

نیپ نے سیکولرزم کو جمعیت العلمائے اسلام پر قربان کردیا

ڈاکٹر محبوب الرحمٰن

سال کے اوائل میں حیات محمد خان شیرپاؤ صوبہ سرحد کے گورنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے تن تنہا صوبے کا نظم ونسق سنبھالا انہوں نے بہت کام کیا۔ سب سے پہلے سابقہ دور حکومت کے مزدور کسان رہنماؤں کو رہا کیا جو سرحد کی جیلوں میں نظر بند تھے۔ بے دخلیوں اور بیگار پر صوبے بھر میں پابندی عائد کی اور اشیائے صرف کی قیمتوں کو معمول پر رکھنے کے اقدامات کیے۔

مئی میں اقتدار نیپ کو منتقل کیا گیا۔ نیپ نے جمعیت اور متحدہ محاذ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے متحدہ حکومت بنائی، گورنری نیپ کو ملی۔ نیپ نے اقتدار کی خاطر سیکولرزم، سوشلزم کو جمعیت العلماء کے اسلامی منشور پر نثار کر دیا۔ سیاسی رشوت کے طور پر صوبے کے تقریباً تمام صوبائی ممبران کو وزیر اور مشیر مقرر کر دیا۔ اس دور میں صوبہ سرحد میں امنِ عامہ اس حد تک خراب ہو گئی کہ دن دہاڑے ڈاکے قتل وغارتگری روز کا معمول بن گئی اور شرفا اور غربا کا جینا دوبھر ہو گیا۔ سوبائی وزراء نے اسلحہ سے اپنی پارٹی کے کارکنوں کو مسلح کرنا شروع کر دیا اور کسانوں، محنت کشوں کے خلاف خوانین کی مسلح فوج تربیت دی۔

روز مرّہ کی اشیاء کے نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اس سے قبل مفتی محمودؔ نے مرکزی وزراء پر یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ بڑی بڑی کاروں میں پھرتے ہیں اگر وہ برسرِ اقتدار آئے تو ویگنوں اور رکشوں میں پھریں گے لیکن جونہی اقتدار کی کرسی مولانا کے ہاتھ لگی انہوں نے ایئر کنڈیشنڈ کاروں اور بنگلوں کا سہارا لیا۔ ضلع ہزارہ اور مالاکنڈ ڈویژن کو اس بناء پر صوبائی بجٹ میں نظر انداز کیا گیا کہ وہ صوبائی حکومت کی بجائے مرکزی حکومت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ وزیرِ اطلاعات و زراعت افضل خان نے زراعت کو ترقی دینے کے بجائے تمام وقت پیپلز پارٹی کو بُرا بھلا کہنے اور خوانین کو مسلّح کرنے میں گزارا اور خوانین کے ذریعے گوجروں اور کسانوں کے گھر جلائے جن میں زندہ بچے اور جانور جھلس گئے۔

وزیر موصوف نے دیر، چترال، مالاکنڈ ایجنسی کے ڈپٹی کمشنروں کو اپنا کٹھ پتلی بنایا اور انتہائی سنگین اور غیر انسانی مظالم ڈھائے اور انہیں ایف سی آر اور "رواج" کا رنگ دیا گیا۔ انہوں نے غریب کسانوں کے کھیتوں سے زبردستی سڑک نکلوائی اور احتجاج کرنے والوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ صوبے میں بے دخلیوں اور بے گار کا سلسلہ از سرِ نو شروع کیا اور صوبے میں تمام تر کسانوں اور مزدوروں کو اس بناء پر گرفتار کیا کہ پنجاب اور سندھ کی حکومتوں نے نیپ کے رہنماؤں کو گرفتار کیا ہے۔ اس لیے ان کے بدلے کسانوں اور مزدوروں کو یرغمال کے طور پر رکھا جا رہا ہے اور جیلوں میں ان پر بدترین مظالم توڑے جا رہے ہیں۔

مالاکنڈ ڈویژن اور ضلع ہزارہ کے قیمتی جنگلات کو نیپ اور جمیعت کے کارکنوں نے صوبائی وزراء کے ایماء پر تباہ کر دیئے۔ اور اس طرح ان جنگلات کا ستیاناس کر دیا گیا۔ تھانہ میں معراج محمد خان کے جلسے میں صوبائی حکومت کے اشارے پر خوانین نے ان پر گولیاں برسائیں۔ اس کے علاوہ عدلیہ اور انتظامیہ مکمل طور پر صوبے میں مفلوج ہو کر رہ گئی ہیں۔ مزدوروں اور کسانوں کا ارزاں خون کھیتوں، گلیوں اور بازاروں میں بہایا جا رہا ہے اور محنت کش طبقے کو جیلوں میں ٹھونس کر بھی نیپ سوشلزم اور کمیونزم کا راگ الاپ رہی ہے اور دوسری طرف اسلام کے علمبردار مولانا مفتی محمود، انگریزوں کے پارلیمانی نظام کو اسلام کا نام دے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں

جہلم

"سب ٹھیک ہے" کا نعرہ لگانے والے پیپلز پارٹی کے بدترین دشمن ہیں

محمد علی

یوں تو ہر جگہ پیپلز پارٹی کے غریب کارکنوں کو سزا دی گئی کہ انہوں نے بھٹو کا ساتھ کیوں دیا۔ مگر جہلم کے حالات کچھ مختلف ہیں۔ یہاں کے غریب کارکنوں کی داستان سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جہلم کے تمام کارکن مکمل طور پر پارٹی سے کٹ چکے ہیں اور اب تو پیپلز پارٹی کا نام لیتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ غریب کارکن منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ اگر پارٹی کا بڑا عہدیدار ایم پی اے یا ایم این اے ہائی کمان کو یہ تاثر دیتا ہے کہ سب ٹھیک ہے تو وہ صدر بھٹو اور پیپلز پارٹی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

جہلم کے سٹی چیئرمین برلاس صاحب نے ابتداء ہی سے عوام دشمن روّیہ اختیار کیا ہے۔ غریب کارکنوں پر پولیس سے مِل کر ظلم کروائے جاتے ہیں۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر وہ سب باتیں کہوں گا جو حقیقت پر مبنی ہوں گی۔ میرا تعلق کسی گروپ سے نہیں اور نہ ہی اس بات پر میرا یقین ہے۔ صرف قائدِ عوام کو پارٹی کے لیے مخلص سمجھتا ہوں۔ برلاس صاحب نے کارکنوں کو دھوکہ دینے کے لیے کبھی کہا کہ "میں شیخ رشید گروپ کا حامی ہوں" اور کبھی کہا کہ —— "میں میاں محمود علی قصوری گروپ کا حامی ہوں!" اس طرح لوگوں کو بیوقوف بنایا۔ اور پولیس سے مِل کر غریب کارکنوں کا استحصال کیا۔ خیر گورنر صاحب نے اس عوام دشمن شخص کو پارٹی سے الگ کر دیا مگر ابھی تک یہ شخص سازشوں سے باز نہیں آیا اور کچھ لوگوں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



اسلام پسندوں نے مغرب کے جمہوری نظام کو کیسے قبول کرلیا؟

انگریزوں کے دور سے آج تک فرنگیوں سے ورثہ میں ملنے والی پاکستان میں رائج الوقت "مغربی جمہوریت" بہر طور و طریق ناکام و نامراد ہو چکی ہے، مگر افسوس کہ وطنِ عزیز کی تمام دینی، سیاسی و مذہبی جماعتیں اور تنظیمیں کلیتاً نہ سہی، تو پیوندکاری کی شکل میں ہی جزوی طور پر "مغربی جمہوری نظام" کے اس استحصالی نظام کے حق میں ڈھٹائی کے ساتھ اس کی مسلسل مدح سرائی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ پاکستان کے عوام تعلیم یافتہ ہوں یا جاہل، بیدار ہوں یا گمراہ اور ترقی پسند ہوں یا اسلام پسند۔ مگر ہر دور میں وطنِ عزیز کے ننانوے فیصد مزدوروں، دستکاروں، چھوٹے دکانداروں و ملازموں، محب وطن افراد، طلبہ، دانشوروں، انقلابی جوانوں، محنت کشوں، کسانوں اور غریب عوام کے "مظلوم طبقے" کی جانب سے پاکستان کا صرف ایک فیصد، سامراج ایجنٹ اجارہ دار جاگیرداروں و سرمایہ داروں کا "ظالم طبقہ" ہمیشہ سے ہی فراڈ کر کے ان کا واحد نمائندہ منتخب ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس طرح اب تک عوام کو صدقہ کا بکرا اور محض آلۂ کار بنا کر بھیڑ بکریوں کیطرح ہانکا جا رہا ہے، جبکہ عوام کا مستقل طور پر یہ گلہ چلا آ رہا ہے کہ ....

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں!

پاکستان میں مغربی جمہوریت کے نام نہاد انتخابات کا ایک ایسا فرضی اور خود ساختہ نظام قائم کر کے رکھ دیا گیا ہے کہ بے پناہ اثر و رسوخ، رعب داب اور حرام کی دولت کو اندھا دھند خرچ کر کے انتخابات ہمیشہ نہایت آسانی اور آٹومیٹک انداز میں ہی جیتے جانے لگے ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ہمارے یہاں "مظلوم طبقے" کا مستقل پروگرام مشینی طور پر صرف ووٹ دینا ہی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ تو عوامی طبقہ ہمیشہ ووٹ ہی دیتا رہتا ہے۔ اور ظالم سرمائے دار طبقے" کا مستقل پروگرام صرف ووٹ حاصل کرنا ہی رہ گیا ہے۔ تو سرمایہ دار طبقہ عوام سے بہر طور و طریق محض فیشن کی طور پر ہمیشہ ووٹ ہی لیتا رہتا ہے۔ ہم دینِ اسلام، حقیقی سوشلزم، اصل جمہوریت، سچے انتخابات اور ٹھوس آئین سازی کے ہرگز بھی مخالف نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ ہی ہمارا تو یہ پختہ ایمان ہے کہ سماجی اقتصادی، انتظامی اور معاشی حالات سدھارے بغیر ہمارے حیات و کائنات کے تمام مسائل کبھی حل ہی نہیں ہو سکتے! بلکہ آئندہ بھی ہمیشہ تشنہ کام ہی رہیں گے۔ اس طرح قیامت تک ہمارا قومی و ملکی استحکام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکے گا۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!

ہمارے یہاں ابتدائی دور سے اب تک اصل جمہوری قدریں کبھی اور کسی بھی مرحلہ پر بیدار ہی نہیں کی گئیں اور نہ ہی پاکستان میں آج تک کبھی کوئی "نظریاتی مملکت" قائم کرنے کی زحمت گوارا کی گئی۔ اس طرح دنیا اسلام اور سوشلزم یعنی دونوں کے اصل اور جامع نظام سے مسلسل فراڈ ہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جبکہ سازش کی طور پر مغربی جمہوریت کو محض اسلام و سوشلزم کے درمیان بطور ڈھال، حربہ اور ایک خود ساختہ دیوار کی مانند جان بوجھ کر حائل کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب ہمیں صرف جبر و استحصال کی "مغربی جمہوریت" کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں کہ جس میں صرف بھوکا مرنے کی آزادی ہو..... اور روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، علاج و روزگار کے جواب میں ہمیں لاٹھی، کفن، قبر، جیل، گولیاں اور دھمکیاں ملیں!!!

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!

سوشلزم صرف ایک معاشی نظریہ ہے۔ یہ کوئی "مذہب یا دین" نہیں ہے کہ جس کا مقابلہ اسلام سے کیا جائے۔ ویسے اگر اس کی بنیاد مادیت پر ہے تو کیا ہوا؟ جبکہ بصیرت کے لحاظ سے اگر ایک ٹھوس نظریہ صفاتی طور پر موجودہ وقت کے تمام تقاضے پورے کرتا اور دنیا کے غریب و مفلس انسانوں کو پستی و بدحالی سے نکال خوشحالی بخشتا ہے تو کیا ہم اسے، محض اس لئے قبول نہ کریں کہ اس کی بنیاد مادیت پر ہے؟ ہم سائنس کے مادی نظام کو کس دیدہ دلیری سے اپنا کر انتہائی فخر محسوس کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تو کیا ہم اب صرف یہ کہہ کر کہ سائنس کا آخروی زندگی یا روح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا ہم سائنس کو ترک کر دیں؟

اب ہم اسلام و سوشلزم میں پائی جانے والی مماثلت کا تفصیلی جائزہ لینے اور تجربہ کرتے ہوتے بالترتیب حسبِ ذیل نکات پیش کرتے ہیں تاکہ اسلام و سوشلزم کے جامع نظام کا آپس میں ربط و ضبط معلوم ہو سکے اور ساتھ ہی ساتھ مغربی جمہوریت کی جملہ فریب کاریاں اور اس میں پائے جانے والے تضادات کھل کر سامنے آ سکیں!!

۱۔ اسلام و سوشلزم۔ یعنی دونوں میں "ایک پارٹی کا نظریہ" ہے، جبکہ ان دونوں کے مقابلہ پر صرف مغربی جمہوری نظام میں "نام نہاد حزبِ اختلاف" کا قیام محض اسی لئے عمل میں لایا جاتا ہے۔ کہ صرف مصنوعی طور پر جمہور کا نام لے کر بذاتِ خود جمہور ہی کے حقوق پر نہایت حسین انداز میں اور بھی آسانی کے ساتھ ڈاکہ ڈالا جا سکے!!!

۲۔ اسلام و سوشلزم۔ یعنی دونوں ہی لامحدود اجارہ دار انفرادی ملکیت اور لامحدود اجارہ دار سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف ہیں بلکہ یہ باتیں صرف "سرمایہ دارانہ معیشت" کا ہی شاخسانہ ہیں، جنہیں صرف مغربی جمہوریت کے شیطانی میں ہی پروان چڑھنے کے مواقع ملتے ہیں!! تاکہ اجارہ دار بڑی بڑی مچھلیاں ملک میں پائی جانے والی باقی ماندہ لاتعداد چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو اور بھی آسانی سے ہڑپ کرتی اور نگلتی چلی جائیں۔

۳۔ اسلام و سوشلزم۔ یعنی دونوں میں تعلیم مفت دیجاتی ہے مگر مغربی جمہوریت کے پروردہ (مادی و ابلیسی) سرمایہ دارانہ نظام میں تعلیم کی قیمت باقاعدہ طور پر وصول کی جاتی ہے۔ اس طرح مغرب کے جمہوری نظام میں حکومت کی جانب سے اعلیٰ تعلیم کا جتنا بھی بندوبست کیا جاتا ہے تو طلبہ سے تعلیم کی اتنی ہی زیادہ قیمت وصول کی جاتی ہے۔

۴۔ ذاتی نفع طلبی و خود غرضی پر مبنی "اجارہ دار انفرادی میلانات" کی اسلام و سوشلزم دونوں ہی نفی کرتے ہیں۔ جبکہ ان کے مقابلہ مغربی طرز کے "جمہوری نظام" میں ان کی جڑوں کو آٹومیٹک انداز میں اور بھی مضبوط کرنے کے جذبہ کو مزید طور پر ابھارا جاتا ہے۔ ویسے رائج الوقت "سرمایہ دارانہ معیشت" کا اصل نچوڑ یہ ہے کہ جس کسی شخص کو جب کبھی اپنا رزق حاصل کرنا پڑتا تو اسے اپنے رزق کے حصول کے لئے دوسروں کے حقوق پامال کر کے پرائی لاشوں پر سے یقینی طور پر گزرنا پڑتا ہے۔

۵۔ اسلام و سوشلزم دونوں میں لامحدود اجارہ دار انفرادی ملکیت کی بجائے اجتماعی ملکیت پر عموماً زیادہ زور دیا جاتا ہے

جبکہ مغربی جمہوریت کے "اجارہ دار سرمایہ دارانہ نظام" میں ہر قسم کی لامحدود اجارہ دار انفرادی ملکیت کو قطعی جائز بلکہ شیرِ مادر کی طرح مقدس و متبرک سمجھا جاتا ہے۔

۶۔ اسلام و سوشلزم۔ دونوں میں حتی الامکان غیر طبقاتی معاشرہ کو ہی فروغ دیا جاتا ہے۔ تاکہ معاشرے میں اونچ نیچ چھوت چھات، آقا و غلام، ظالم و مظلوم اور حاکم و محکوم، کا سرے سے قطعی کوئی وجود ہی باقی نہ رہے جبکہ ان ہی برائیوں کو اچھالنے کے لئے مغربی جمہوریت کے سرمایہ دارانہ نظام میں "طبقاتی کشمکش" کے ابھار کو محض عوامی جبر و استحصال کی خاطر ہی جنم دیا جاتا ہے۔

۷۔ اسلام و سوشلزم۔ دونوں میں اہلیت، نوعیت اور ضرورت کے مطابق بنیادی ضروریاتِ زندگی کے مواقع سب کے لئے یکساں اور مساوی طور پر مہیا کئے جاتے ہیں۔ جب کہ مغربی جمہوری نظام میں نمائشی لیبل تو بصارتی یا اسمی طور پر فقط "نام نہاد جمہوریت" کا ہی ہوتا ہے۔ مگر بصارتی یا بصیرت کے لحاظ سے سرمایہ دارانہ نظام میں خاص سازش کے تحت بنات خود جمہور کو ہی، ان کی تمام ضروریاتِ زندگی سے یکسر محروم کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

۸۔ اسلام و سوشلزم دونوں میں "سود" قطعی حرام ہے۔ مگر ان کے مقابلہ پر "اجارہ دار سرمایہ دارانہ معیشت" میں "سود" قطعی طور پر حلال اور جائز ہے۔ لہٰذا اگر آج کی اس موجودہ دنیا سے صرف "سود" کو نکال باہر کیا جائے تو کل روئے زمین پر ایک ایسا بھیانک اور خوفناک ترین زلزلہ آ سکتا ہے کہ جس سے دنیا کے تمام سرمایہ دار ممالک کی "موجودہ معیشت" بیک وقت تباہ و برباد ہو سکتی ہے۔ مزید برآں ان کی پوری مشینری بھی جامد و ساکت ہو کر قطعی نیست و نابود ہو سکتی ہے نہ صرف یہ بلکہ "سود" کی محض اسی ایک تبدیلی سے بذاتِ خود "اقوام متحدہ" کی یہ فلک بوس عمارتیں بھی چشم زدن میں "زمین بوس" ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹ سکتی ہیں !!!۔

تدبّر کی فسوں کاری سے قائم رہ سکتا نہیں
جہاں میں جس تمدن کی بنا پر سرمایہ داری ہو

(خلیل اے پاکستانی۔ گھوٹکی)

افغانستان میں پاکستانی شعبۂ اطلاعات کی ناقص کارکردگی

عرصہ سے مختلف حلقوں کی طرف سے بیرونِ ملک پاکستانی سفارت خانوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے حکومت پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ضروری اقدام کرے گزشتہ دنوں جب مجھے افغانستان جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کابل میں پاکستان کے سفارت خانے کے شعبۂ اطلاعات کی ناقص کارکردگی دیکھ کر احساس ہوا کہ واقعی بیرونِ ملک ہمارے اطلاعاتی شعبے محض وقت گزاری کے لیے ہیں اور عملے کے لوگ صرف تنخواہ لینے اور دفتری وقت پورا کر کے گھر جانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

ہماری دلی خواہش تھی کہ کابل میں پاکستانی سفارت خانے کی کارکردگی کے متعلق مواد حاصل کر کے مضامین لکھے جائیں اس سلسلے میں بڑی مشکل سے پریس اتاشی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہم نے انہیں بتایا کہ "ہم پاکستان سے آئے ہیں اور سفارت خانہ کے متعلق خصوصاً سفارت خانہ کے شعبۂ اطلاعات کی کارکردگی کے بارے میں معلومات چاہتے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں آپ ہماری مدد کیجئے!"

یہ سن کر انہوں نے شانِ بے نیازی سے ہماری طرف دیکھا اور کہا کہ —— "یہ میرا کام نہیں اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت ہے۔ آپ کسی اور سے ملیں!"

ہم ان کے دفتر سے باہر آ کر سوچنے لگے کہ جب سفارت خانے کا پریس اتاشی ہی معلومات مہیا نہ کر سکے تو سفارت خانے کی دوسری کونسی شخصیت اس کام میں معاون ثابت ہو سکتی ہے؟

سفارت خانہ پاکستان کے باہر پاکستان میں ہونے والی سرگرمیوں سے آگاہ کرنے کے لیے جو تصاویر لگائی گئی ہیں۔ ان سے بھی اطلاعاتی شعبے کی ناقص کارکردگی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ تصاویر کئی کئی ماہ پرانی ہیں۔ بیشتر تصاویر پر گرد جمی ہوئی ہے جنہیں صاف کرنے کی فرصت شاید اطلاعاتی شعبے کے —— کسی کارکن کو نہیں۔

اطلاعاتی شعبے کے زیرِ اہتمام پبلک لائبریری کی حالت بھی ناگفتہ بہ ہے۔ لائبریری کبھی کبھار بغیر کسی وجہ کے بند رہتی ہے۔ لائبریرین کا رویّہ کرخت اور درشت ہے۔ بیشتر اخبار پرانے پڑے ہوتے ہیں حالانکہ تازہ اخبارات شام چار بجے تک جی ٹی ایس کے ذریعے پہنچ جاتے ہیں۔ ہم نے تیرہ ستمبر کو آٹھ اور نو ستمبر کے "مشرق" اور "جنگ" پڑھے اور ۱۷ ستمبر کو ۱۵ ستمبر کا "خیبر میل" اور "پاکستان ٹائمز" پڑھا۔ ہمیں ایک صاحب نے بتایا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ کئی مہینوں سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جب سے نئے پریس اتاشی نے چارج لیا ہے لائبریری اور اس شعبے کی کارکردگی روبہ تنزّل ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ سابق پریس اتاشی ہر روز لائبریری کا معائنہ کرتے تھے اور ان کے دور میں کسی کو غفلت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کے جاتے ہی کارکردگی کا معیار بدل گیا یہ بھی سنا گیا کہ اس لائبریری میں اب نئے رسائل اور نئے اخبار پہلے لائبریرین کے دوست احباب پڑھتے ہیں اور اگر وہ مناسب سمجھیں تو دو تین روز بعد یہ اخبار اور رسائل لائبریری میں لا پھینکتے ہیں۔ ورنہ پڑھنے والے کو پرانے اخباروں پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

دوسرے غیر ملکی سفارت خانوں کے شعبۂ اطلاعات کے زیرِ اہتمام آئے دن تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ مہینے میں ایک آدھ بار فلم شو بھی ہوتا ہے۔ ہمارے سفارت خانے کے شعبۂ اطلاعات کی کارکردگی اس سلسلے میں صفر ہے۔ اگر کسی تقریب میں عام داخلے کی اجازت بھی ہوتی ہے تو آنے والوں کا خیر مقدم خوش اخلاقی سے نہیں کیا جاتا (یہ بات چند افغانیوں نے بتائی)

مندرجہ بالا امور دیانتداری، ایمانداری اور حب الوطنی کے تحت پیش کیے گئے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ بیرونِ ملک سفارت خانوں میں اہم عہدوں پر بھیجے جانے والے افراد کو اس بات کی خاص تربیت دی جائے کہ ان کی خوش خلقی ہی میں وطن کی شان اور عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

شعبۂ اطلاعات کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

سفارت خانے کے عملہ کے دیگر افراد کو اس امر کی سختی سے ہدایت کی جائے کہ وہ کسی مسافر، سیاح یا غیر ملکی سے گفتگو کرتے وقت ماتھے پر تیوریاں نہ چڑھائیں ——!

گفتگو کے دوران "ہوں، ہاں، پھر" قسم کے الفاظ استعمال کرنے کی بجائے —— "جی، اچھا بہتر" قسم کے شائستہ الفاظ کا استعمال کریں۔ کیونکہ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے متعلق کوئی آرڈی نینس یا قانون بنایا گیا ہے۔

(سید مہدی حسن)

بقیہ: احوال واقعی

سے درآمد کر رہے ہیں تاکہ کاروبارِ مملکت چلا سکیں۔

یہ بھی خبریں ہیں کہ ذرا امریکہ کے انتخابات ہو لیں پھر امریکی امداد کا ایک سیلاب پاکستان میں آنے والا ہے جو بائیں بازو والے تمام لوگوں کو بہالے جائے گا۔ عالمی بنک اور کنسورشیم والوں نے بھی پاکستانی حکومت سے کہا ہے کہ اِس وقت جو زبانیں سوشلسٹ معیشت کے حق میں کھلتی ہیں انہیں بند کر دیا جائے تو ہماری امداد رواں دواں ہو جائے گی۔ ملک کو سوشلسٹ معیشت کی طرف لے جانے کے نعرے اور عالمی بنک و کنسورشیم کی امداد ایک ساتھ نہیں چل سکے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ صدر بھٹو کو ملٹری اور سوِل بیوروکریسی نے باور کروا دیا ہے کہ یہ لٹا پٹا ملک امریکی فوجی و مالی امداد کے بغیر نہیں چل سکتا، صرف اپنے پاؤں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے صدر بھٹو جو کسی زمانے میں امریکی امداد کے سخت مخالف تھے اور چین سے دوستی کا اعلان کیا کرتے تھے اب امریکی امداد کے منتظر ہیں۔ امریکہ امداد دینے کے لیے صدر ایوب پر جو شرائط عائد کرتا تھا وہی شرائط اب صدر بھٹو پر بھی عائد کی جا رہی ہیں۔ صدر ایوب کو بھی وزیروں کے استعفے لینے پڑتے تھے اور اب بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔

حال ہی میں کچھ تقرریاں بھی ہوئی ہیں —— یہ صرف امریکی امداد کے ٹریلر ہیں، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا —— !

بہرحال اے ہم وطنو! اک ذرا صبر کہ بیداد کے دن تھوڑے ہیں!

امریکی انتخابات ہونے والے ہیں —— پھر اپنے "وارے نیارے" ہوں گے —— ملک میں دودھ کی نہریں بہیں گی۔ اب تو نیویارک لندن سے پاکستانیوں کو بلا کر براہِ راست عہدے دیئے جاتے ہیں —— پھر خود اصلی اور حقیقی امریکی گورے آئیں گے اور وہ ماہرین اور مشیروں کی صورت میں پاکستان کو "خوشحالی" کے راستے پر لے جائیں گے۔

مزدورو —— ! اپنے دکھ درد بھول جاؤ۔

طالب علمو —— ! بلاوجہ سوچنا چھوڑ دو۔

کسانو —— ! امریکی کھاد ملنے والی ہے۔ اب اپنی پریشانیاں بھول جاؤ!

امریکہ اور روس ہم پر پھر مہربان ہو رہے ہیں ہمارے اقتصادی حالات سے فائدہ اٹھا کر امریکہ ہم پر اقتصادی رحمتیں نازل کرنے والا ہے —— پیپلز پارٹی نے اپنے اقتدار کی کشمکش میں عوام اور محنت کشوں کا اعتماد کھو دیا، ان سے اس ملک کو اقتصادی طور پر مضبوط کروانے کی بجائے امریکی ماہرین سے مضبوط کروایا جائے گا —— شاید صدر بھٹو یہ بھول گئے ہیں کہ امریکی ماہرین اپنے ساتھ صرف امداد ہی نہیں بلکہ اقتدار کی بھی حکمت عملی لے کر آتے ہیں کہ ایک صدر اور وزیرِ اعظم کو کب تک اپنے عہدے پر رہنے دینا ہے اور کب اپنی مرضی کا دوسرا آدمی لایا جانا ہے۔

یہ امریکی ماہرین "سی۔ آئی۔ اے" کے ماہر بھی ہوتے ہیں —— ہمیں اپنے عزیز وطن سے بھی محبت ہے اور اپنے عزیز صدر سے بھی ہمدردی ہے، اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ امریکہ اور روس ہماری دونوں عزیز چیزوں کے دشمن ہیں۔

بقیہ: خیبر سے کھاریاں تک

کو ساتھ ملا کر سازشوں میں مصروف ہے۔ جس کا بڑا تباہ کن نتیجہ نکلا۔

اس کے بعد ڈسٹرکٹ چیئرمین کے عہدے پر مُلّا عباس شاہ صاحب براجمان ہوئے جو خاندانی طور پر پولیس کے مخبر ہیں مگر پیپلز پارٹی میں گھس آئے اور خوب "مال" کمایا و غریبوں کی عزت و ناموس کو ملیت و نابود کیا۔ شاہ صاحب کی ذات صرف چند لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے اور ڈاکٹر غلام حسین کا نام لے کر انتظامیہ سے ملی بھگت کر کے غریب لوگوں کا بھی استحصال کرتے ہیں۔

اس کے بعد جناب عبدالغفار صاحب ایم پی اے سابق مشیر ٹرانسپورٹ آئے۔ یہ اتنے سخی ثابت ہوئے ہیں کہ کھلے عام غریب عوام کو ننگی گالیاں دیتے ہیں۔ غریب کارکنوں سے ڈپو چھین کر اپنے خاص آدمیوں کو دِلا دیئے۔

جہلم کے غریب لوگوں کی ایک آخری امید ڈاکٹر غلام حسین تھے مگر وہ بھی گورنر صاحب کے مشیر ہونے کی خوشی میں اب وہ کام نہ کر سکیں گے جو ان سے توقع کی جاتی تھی۔

جہلم کے غریب کارکنوں کو حال ہی میں ایک ایسی سازش کا شکار ہونا پڑا جسے غلام عباس شاہ، برلاس اور پولیس کے مخبروں نے مل کر تیار کی تھی۔ کارکن سوچ رہے ہیں کہ وہ اپنی فریاد لے کر کس کے پاس جائیں۔ کیونکہ نوکر شاہی نے مقامی پیپلز پارٹی کے ڈسٹرکٹ چیئرمین اور سٹی چیئرمین کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور مقامی ایم پی اے جو وزارت سے پہلے عوام کی خدمت کے بڑے دعویدار تھے انکو وزارت کا ایسا چسکا پڑا ہے کہ اب مہینوں غریب کارکنوں کو نظر تک نہیں آتے۔ اس کے علاوہ تحصیل کے چیئرمین راجہ مختار صاحب غریب لوگوں سے ہزار دل روپے بٹور کر کھا چکے ہیں۔

ظلم انتہا کو پہنچ چکا ہے اور پولیس سرِعام رشوت لے رہی ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ کہانی ختم ہونے والی ہے۔ اگر یہ ہو گیا تو اس کے بعد ملک کا کیا بنے گا۔ کیونکہ غریب کارکن پہلے ہی ظلم سہ رہے ہیں۔ یہ ایم۔ پی۔ اے، ایم این اے تو کل کسی اور پارٹی میں جا گھسیں گے۔ قائدِ عوام کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ حالات کو بر وقت سنبھال سکتے ہیں تو سنبھال لیں۔ پھر وقت ہاتھ نہ آئے گا۔

بقیہ: افسانہ

کی تو انہوں نے فرمایا —— "کل سے ہم سکول ٹائم کے بعد انہیں انگریزی پڑھایا کریں گے اس کی فیس پانچ روپے ہوگی اور سب بچے یہ فیس دیا کریں گے۔ صدرِ انجمن کا یہی حکم ہے۔ اگر تم یہ فیس دینا نہیں چاہتے تو اپنے بچے کو لے جاؤ۔"

تھوڑی دیر اللہ دتہ چپ چاپ کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر لیکایک اس نے آگے بڑھ کر اسمٰعیل کا بستہ اٹھایا اور بولا —— "آجا بیٹا! گھر چلیں، تیرے نصیبوں میں علم نہیں ہے۔" ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اگلے دن اللہ دتہ سر پر اوزاروں کا ڈبہ اٹھائے۔ کاندھے کے اوپر سے اپنی پشت پر کوئلے اور دھونکنی والی بوری لٹکائے "پانڈے قلعی کرا لو" کی لمبی لمبی آوازیں لگاتا ہوا شہر کی گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کا ننھا سا اکلوتا بیٹا اسماعیل اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسمٰعیل کے سر پر ٹین کا ایک ڈول تھا جس میں تیزاب کی بوتل قلعی کی لمبی لمبی پتیاں، نوشادر کی ڈلیاں اور میلی سی روئی تھی۔

'خدائی بستی' کے بعد الفتح مطبوعات کی ایک اور پیشکش

شنگھائی کی عورتیں

چین کے جاگیردارانہ عہد کی مظلومیت اور بہیمیت کی تصویر

ڈرامہ کے روپ میں

عظیم مصنف اور ڈرامہ نویس تورے زیتسہ ہوم کے قلم سے

— جس کو —

جمیل الدین عالی اور افضل صدیقی نے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے

اسٹیج ڈرامہ کی انوکھی تکنیک

عمدہ کاغذ —— آفسٹ طباعت —— قیمت تین روپے

ایجنٹ حضرات آج ہی اپنی مطلوبہ تعداد سے آگاہ کریں

ہفت روزہ الفتح کراچی

۸۷۔ ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس، کراچی ۲۹ ۹، فون: ۴۔۴۱۲۲۷۴

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi

26-Oct. - 2 Nov. 1972